اردو غزل کی ماہِ تمام
پروین شاکر
ڈاکٹر روبینہ شبنم

نامِ مصنّفہ : ڈاکٹر رُوبینہ شبنم

تعلیم : ایم۔اے (اُردو۔فارسی)

پی۔ایچ۔ڈی

پیشہ : درس وتدریس

دیگر مشاغل : شعر وشاعری

ایڈریس : لیکچرار، نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ

(پنجابی یونیورسٹی) اندرونِ دہلی گیٹ

مالیر کوٹلہ، پنجاب

اردو غزل کی ماہِ تمام پروینؔ شاکر

ڈاکٹر روبینہ شبنمؔ

نام کتاب : اردو غزل کی ماہِ تمام پروین شاکر

مصنفہ : ڈاکٹر روبینہ شبنم

سنہ اشاعت : ۲۰۰۴ء

تعداد : ۴۵۰

قیمت : ۱۵۰/- روپے

مطبع : بھارت آفسٹ، دہلی-۶

ملنے کا پتہ

۱- منیبہ نور
محلہ مالیر، نزد حضرت شیخ،
مالیرکوٹلہ، پنجاب

۲- ماڈرن پبلشنگ ہاوس
9- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
فون: ۲۳۲۷۸۸۶۹

انتساب —

امی جی اور بابو جی کے نام

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

جدید ادبی سرمائے میں خواتین کا بہت بڑا حصہ رہا ہے خصوصاً ناول اور افسانے کی دنیا میں کئی خواتین کے نام عزت و احترام کے ساتھ لئے جاتے ہیں جن میں عصمت چغتائی، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، رضیہ فصیح احمد، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے پہلے رشید جہاں کے افسانے ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا چکے تھے جو جدید عورت کے باغیانہ خیالات و جذبات کی عکاسی کر رہے تھے مگر ان دنوں شاعری کے میدان میں ایسی کوئی بھی خاتون نہیں تھی جو اپنے فن کے لحاظ سے کوئی نمایا مقام حاصل کر سکتی ہو۔ جب ہم تاریخ ادبِ اردو کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں کچھ مثالیں ضرور ملتی ہیں مگر ان میں اہم نام معدودے چند ہیں۔ پرانے وقتوں کی شعر کہنے والی عورتیں یا تو بیگمات اور شہزادیاں ہیں یا پھر ان کا تعلق بالا خانوں اور کوٹھوں سے ہے۔ وہ یا تو دیویاں ہیں یا گڑیاں ہیں۔ ایک جیتی جاگتی LIVING عورت ہمیں نہیں ملتی۔ یہ سانس لیتی ہوئی عورت ہمیں جدید اُردو شاعری میں دستیاب ہوتی ہے۔ شعر کہنے والی عورت کو اُردو معاشرے نے آہستہ آہستہ اب قبول کیا ہے لیکن ان میں بھی پروین شاکر کو جو مقام و مرتبہ نصیب ہوا ہے وہ کسی اور کو نہیں ملا۔

پروین شاکر کا تعلق ہمارے اپنے عہد سے ہے۔ اس کے یہاں تجربات بہت گونا گوں ہیں اور اظہار میں ایک انٹلکچویل سطح بھی ہے۔ اس کی شاعری بنیادی طور پر عشق کے جذبات و تجربات کی شاعری ہے اور اُردو کی عشقیہ شاعری کے سرمائے میں ایک نہایت منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے۔ عورت کے عشق کی شاعری کا بھر پور رنگ ہمیں میرؔا بائی کے یہاں ملتا ہے۔ پروینؔ بھی اس رنگ میں اپنا ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ عشقیہ شاعری میں میرؔا اور پروین دونوں کی کامیابی کے درجے یقیناً مختلف ہونگے لیکن دونوں کو جس حد تک بھی کامیابی نصیب ہوئی اس کا راز دونوں کے اندر عشق کی غیر معمولی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔ پروین شاکر نے کہا تھا:

> "شاعری اپنے ماحول اور زمین سے پھوٹتی ہے۔ ہمارے یہاں میرؔا بائی کی روایت تو تھی، جہاں عورت شعر کہتی ہے اور اسے

اپنے عورت ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے اور وہ اپنے محبوب کی شخصیت ،اس کے لباس ،اس کے مزاج ،اس کے طور طریقے سبھی کچھ شعر میں بیان کرتی ہے ۔یہ بات آپ کو دکنی شاعری میں بھی ملے گی۔ [1]

ادبی تاریخ سے متعلق ذخائر کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس اس میں گنتی کی چند ادبی حیثیت کی حامل خواتین کا ہی ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی محض اُردو ناول نگار خواتین کو ہی قابلِ اعتنا سمجھا گیا ہے ۔اُردو شاعرات میں کوئی ایسی قد آور شخصیت سامنے نہیں آئی جس کو موضوعِ تخلیق بنایا جا سکتا ۔بلا شبہ پروین شاکر صنفِ شاعری میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز نظر آتی ہے۔

پاکستان ایک چھوٹا سا لسانی ملک ہے ۔وہاں کسی ادیب یا شاعر کا مشہور ہونا کوئی بڑی مشکل بات نہیں لیکن ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں لسانی الجھاوے بھی بڑے ہوں وہاں کسی شاعر یا شاعرہ کی مقبولیت غیر معمولی واقعہ ہی کہا جا سکتا ہے ۔اُردو والوں میں تو پروین شاکر مقبول و معروف رہی لیکن ہندوستان کی دیگر بڑی زبانوں میں بھی اس کی شاعری کی گونج رہی ہے ۔اس کے شعر گھر گھر پہنچے ۔ہندوستان کی کئی زبانوں میں بطورِ خاص ہندی میں اس کی شعری تصنیف ''خوشبو'' کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ۔یہ شعری مجموعہ پروین شاکر کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور گزشتہ دو دہائیوں کا سب سے مقبول ترین شعری مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ پاکستان میں جتنی مقبول شاعرات ہیں ان میں سے زیادہ تر شاعرات کا تعلق شمالی ہندوستان سے رہا ہے ۔ادا جعفری پاکستان جانے سے پہلے ادا بدایونی تھی،کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کا تعلق یو۔پی سے تھا اور پروین شاکر کے والد صوبہ بہار کے ضلع گیا کے گاؤں شیخوپورہ کے رہنے والے تھے ۔پروین شاکر ۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئی ۔اس کی شاعری کی شروعات ۱۹۶۸ء میں ہوئی جب وہ سولہ برس کی تھی ۔پروین شاکر اُردو کے علاوہ فارسی ،عربی ،انگریزی اور فرنچ زبانوں پر مہارت رکھتی تھی ۔اس نے احمد ندیم قاسمی کی منتخب نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا ۔اگرچہ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند تھی اور احمد ندیم قاسمی کو اپنا پیش رو مانتی تھی لیکن وہ انتہا پسند نہیں تھی ۔

---

[1] سہ ماہی اسباق ،شمارہ فروری تا ستمبر ۹۵ء عبدالاحد ساز صفحہ ۱۵

سرحدیں آرٹ اور ادب کو تقسیم نہیں کر سکتیں اور رشتے محض ذاتی یا سماجی نہیں ہوتے بلکہ فکری ،فنی اور جمالیاتی بھی ہوتے ہیں۔پروین شاکر بلا شبہ ایک عظیم شاعرہ تھی ۔ہندوستان اور پاکستان کی ادبی برادری کی وہ ایک اہم اور قابلِ فخر رکن تو تھی ہی لیکن اس نے اپنی نئی نسل کے لکھنے والوں کو کافی حد تک متاثر کیا ۔اس نے بیالس سال کی مختصر عمر میں اپنی بھر پور شعری شناخت قائم کر لی تھی اور نئی نسل میں بطورِ خاص خواتین شاعرات میں ،چاہے وہ ہندوستان کی ہوں یا پاکستان کی،ایک نمائندہ شخصیت کی حامل تھی ۔

☆☆☆

باب اول

تعارف

پیدائش

پروین شاکر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئی ۔والد کا نام سیّد شاکر حسین اور تخلص ثاقب تھا ۔وہ صوبہ بہار کے ضلع گیا کے شیخوپورہ گاؤں کے رہنے والے تھے ۔طالبِ علمی کے زمانے ہی سے شعر کہتے تھے ۔اسی دور میں بہت سے انعام شعری مقابلوں میں ملے اورساتھ ہی کئی گولڈ میڈل حاصل کئے ۔ان کی دولڑکیاں تھیں ۔ایک کا نام نسرین اور دوسری کا پروین ہے۔نسرین نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی وہ ہومیوپیتھک ڈاکٹری کا کام کرتی ہے۔ والد کے فوت ہو جانے کے بعد والدہ کا سہارا رہی کیونکہ والدہ دل کی مریض تھیں ۔نسرین زیادہ تعلیم نہ حاصل کر سکی ۔پروین چھوٹی تھی اسے اعلیٰ درجے کی تعلیم سے آراستہ کیا ۔وہ اپنے والد کی طرح معصوم تھی ۔بہت جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتی ۔اس کے ابتدائی کلام پر اپنے والد کا رنگِ سخن نمایاں تھا ۔والد اس پر خوش رہتے اور پروین کی شاعری پر انہیں بڑا فخر ہوتا ۔

تعلیم

پروین کا شمار بچپن سے ذہین وفطین طالبہ میں ہوتا تھا ۔وہ اپنی ہر کلاس میں بہترین پوزیشن حاصل کرتی ۔پروین نے میٹرک کا امتحان رضویہ گرلز ہائی اسکول ،کراچی سے پاس کیا ۔ ۱۹۷۱ء میں سر سیّد گرلز کالج سے انگلش لٹریچر کے ساتھ بی۔اے(آنرز) کیا ۔ ۱۹۷۲ء میں جامعہ کراچی میں داخل ہوئی اور یہاں سے ایم۔اے انگلش کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ سیکنڈ ایم۔اے کی ڈگری لسانیات میں جامعہ کراچی سے حاصل کی ۔ ۱۹۹۲ء میں ماسٹرز ان بینک ایڈمنسٹریشن کی ڈگری ہارڈورڈیونیورسٹی سے حاصل کی پھر اسی سال منیجمنٹ انفارمیشن کا کورس کیا ۔''رول آف میڈیا ان ۱۹۷۱ء وار'' پر وہ اب پی ایچ۔ڈی کا تھیسس لکھنا چاہ رہی تھی اور اس سلسلہ مین عنقریب امریکہ جانے والی تھی۔

ملازمت

اپنی ملازمت کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروین نے کہا ہے کہ وہ ماسٹرز کرنے کے بعد پی ایچ۔ ڈی کے لئے باہر جانا چاہتی تھی لیکن نہیں جا سکی کیونکہ پی ایچ۔ ڈی کے لئے باہر جانے کے پروسس سے ناواقف تھی ۔کالج میں پرنسپل نے
پروین کو ٹیچنگ پر مامور کر دیا اس طرح وہ ان کے کہنے پر پڑھانے لگ گئی ۔پھر

پی سی کے انٹرویوز ہوئے تو سلیکٹ ہو گئی ۔اس وقت کالجز نیشنلائزڈ نہیں ہوئے تھے ۔پروین کو عبداللہ گرلز کالج،کراچی میں پڑھانے کے لئے بھیج دیا گیا۔درس و تدریس کا یہ تجربہ پروین کے لئے نیا تھا کیونکہ اسٹوڈنٹس پڑھنا نہیں چاہتے تھے ۔جن طلبہ سے اس کا واسطہ پڑا تھا ان میں اکثریت ایسوں کی تھی جنہوں نے چھٹی جماعت کے بعد سے انگریزی پڑھی ۔انہیں انگریزی پڑھانا ویسے بھی دشوار تھا ۔ان کے لئے ڈکن وغیرہ بہت مشکل تھے اور پروین انہیں جین آسٹن پڑھا رہی تھی جس کے باعث ٹیچر اور اسٹوڈنٹس میں افہام و ترسیل کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس نے ملازمت کی تبدیلی پر توجہ دی اور سول سروس کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کر کے محکمۂ کسٹمز سے وابستہ ہو گئی ۔عبداللہ کالج میں اس کی خدمات کا عرصہ نو سال پر محیط ہے۔ ۱۹۸۲ء سے سیکنڈ سیکریٹری سی۔بی ۔آر (اسلام آباد) متعین ہوئی اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایڈمنسٹر، راولپنڈی اس کے علاوہ ڈپٹی کلکٹر ،اسلام آباد کے عہدوں پر فائز رہی۔

شعر گوئی

شعری روایت میں ایک اثنیٰ عشری گھرانے میں آنکھ کھولنے والی بچی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شعر کے آہنگ کو جزوِ سماعت بنا چکی ہوتی ہے ۔شاعری میں انیسؔ کے اشعار غیر شعوری طور پر اس کی لفظیات کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں اور سچ بولنے میں اکثر سادہ لفظ آہنگ کی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں سو زبان کی وہ تہذیب جو ہمیں اکثر شعوری طور پر کرنی پڑتی ہے پروینؔ شاکر نے ورثے کے طور پر پائی ہے۔گویا ایک بڑی منزل سفر شروع کرنے سے پہلے ہی طے ہو گئی ۔گمان کہتا ہے کہ گڑیا سی لڑکی اپنے ننھے سے وجود میں وہ شدید جذبے اور تجربات جن میں انسانی رشتوں کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر جذبوں کا ارتفاع بھی تھا اور رزم و بزم کی دھڑکتی واردات بھی ،عقیدت کے معجزے بھی تھے اور واقعہ نگاری کے کمالات بھی ،چپ چاپ اپنے اندر جذب کرتی رہی ،یہیں سے اس کی شخصیت کے دو واضح رخ سامنے آتے ہیں۔

پروینؔ کے گھر میں بھی شاعرانہ ماحول تھا ۔پروین نے شاعری کا ذوق اپنے والد سے لیا ۔اس کی شاعری کا آغاز کالج میں جا کر ہوتا ہے اس وقت وہ فرسٹ ائیر کلاس میں تھی اور اس نے اپنا تخلص 'بینا' رکھا تھا ۔شاعری کی اصلاح اپنے نانا سے کرواتی تھی ،والد حیات

میں اس کی شاعری پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے ۔یہ شاعری ان کے خاندان کو ورثے میں ملی تھی ۔پروینؔ کی بڑی بہن نسرینؔ بھی شعر کہتی تھی مگر وہ منظرِ عام پر نہیں آئی مبادہ لوگ خواہ مخواہ دونوں بہنوں کا موازنہ شروع کر دیں ۔نسرینؔ ایک غمزدہ بلڈ کینسر کی مریضہ تھی ۔ایک یہ بھی وجہ تھی جس سے وہ شاعری میں مقام حاصل نہ کر سکی۔

> ''پروینؔ شاکر نے اپنی شاعری کا آغاز خوشبو کے وطن یعنی خوش رنگ پھولوں ،خوشنما رنگوں اور خوش نوا طائروں کی وادی سے کیا مگر جلد ہی زندگی نے ان کی راہوں میں کانٹوں کے جال بچھا دئے ۔کیونکہ وہ طبعاً گلشن پرست واقع ہوئی ہیں لہذا نہوں نے پھول ہی نہیں چنے کانٹے بھی سمیٹ لئے ۔نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غم و خوشی کی لہریں بیک وقت ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں ۔تخلیق کی دیوی ان کے ہاں بہ چہرا تبسم بہ چشمِ تر آئی ہے۔'' [1]

شادی

جونہی پروینؔ جوان ہوئی تو اسے بہت سے رشتے آئے مگر آخرِ کار اس کی شادی اس کے خالہ کے لڑکے نصیر علی سے ۱۹۷۶ء میں ہوئی جو ملٹری میں ڈاکٹر تھے ۔حالانکہ اس کی شادی اس کی رضامندی سے ہوئی تھی لیکن شادی کے بعد اس کی زندگی میں پریشانی اور مایوسی چھا گئی جس کے اسباب کا کہیں. سے کوئی پتہ نہیں چلتا ۔ناجانے کیوں محبت یکدم نفرت میں تبدیل ہو گئی اور اس کی ازدواجی زندگی زیادہ عرصے تک خوشگوار نہ رہ سکی ۔پروینؔ نے سسرال والوں کو خوش کرنے کے لئے تمام حربے استعمال کئے مگر وہ ناکام رہی اور آخر شادی ٹوٹ گئی جس کے باعث پروین پر ڈیپریشن کا دورہ پڑا اور وہ سکونِ دل کے لئے بے قرار رہی ۔یہ بے قراری اس کے اشعار میں درد بن کر جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے :

"The man who sets out to tell the story of his life ,paints a true portrait of himself ,though quite unconsciously,by showing that he is constantly relapsing,without wishing to do so." (2)

اپنی محرومی کو وہ ایک شعر میں اس طرح بیان کرتی ہے ؎

۱۔ ماہنامہ شاعر شمارہ ۱۲ مضمون : پروینؔ شاکر از آفتاب احمد صفحہ ۱۲

۲۔ The art of writing P:58

میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کمی تھی کس شئے کی
کہ سب کا ہو کے رہا وہ بس اک مرا نہ ہوا

پروین کے ادبی دائرے کے مخالفوں اور کچھ اس کی سہیلیوں نے اس کے خلاف بے بنیاد اسکینڈل کھڑے کر دیئے جو وہ برداشت نہ کر سکی اور بیمار پڑ گئی ۔اس نے ریڈیو اور مشاعروں میں جانا بند کر دیا ۔پروین کی زندگی میں اور کئی حادثات و واقعات رونما ہوئے لیکن طلاق کے حادثے نے اس کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے اور جو اس کی شخصیت کا عنصر بن کر اس کی شعری تخلیقات میں کھلی کتاب بن کر رہ گیا ۔جب اس سے پوچھا گیا کہ اسے زندگی میں کونسا بڑا دھچکا لگا ہے تو اس نے نہایت حسرت کے ساتھ جواب دیا تھا:

"I AM A SINGLE PARENT جس سوسائٹی میں ہم رہتے ہیں وہاں یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ .IT IS HARD LIFE TO LIVE میں کوشش کرتی ہوں کہ اسے خوشگوار بنا سکوں۔"[1]

اولاد

پروین کو ڈاکٹر نصیر سے ایک بیٹا ہے جس کا نام مراؔد ہے جسے وہ پیار سے گیتو پکارتی تھی۔مطلقہ ہونے کے بعد اسے کسی اور نئے رشتے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی اس لئے کہ اب اس کی زندگی کا مقصد اپنے TEENAGE بیٹے کی تعلیم و تربیت رہا تھا ۔مراد سے پروین کی وابستگی غیر معمولی تھی ۔جب تک وہ بقید حیات رہی اسی کے بارے میں سوچتی رہی ۔ مراد نے کبھی شاعری نہیں کی اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ نیورو سرجن بنے۔

گھریلو مصروفیات

پہلے پروین کو کھانا بنانا نہیں آتا تھا لیکن بیٹے کا چٹورا پن دیکھ کر اس کی وجہ سے سیکھنا پڑا ۔خود پروین کو کھانوں میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن گھر کی صفائی اور سجاوٹ پر وہ بہت زیادہ دھیان دیتی تھی ۔اسے مہمانوں کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا اور ان کے اہتمام کے لئے گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی چیز ضرور رکھتی تھی ۔

اعزازات

۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء سے ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء تک پروین نے اپنی زندگی کے اس چھوٹے سے

[1] خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر صفحہ ۳۵

سفر میں جذبے، احساس و شعور کے بڑے فاصلے طے کئے تھے اور اپنے تخلیقی سفر کی روداد کو ادبی دنیا کے سامنے پانچ شعری مجموعوں خوشبو، صد برگ، خود کلامی، انکار اور کفِ آئینہ کی شکل میں پیش کر دیا۔ جب پروین کی پہلی کتاب "خوشبو" شائع ہوئی تو اس وقت اس کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ 'خوشبو' کو عوام الناس نے تو پسند کیا ہی احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری اور احمد فراز جیسے بڑے شاعروں نے بھی داد سے نوازا۔ وہ غالباً اس عہد کی واحد اُردو شاعرہ تھی جسے اس کم عمری میں اپنی فنی صلاحیت اور استعداد کے بل پر پانچ بڑے ادبی انعامات و اعزازت حاصل ہوئے تھے۔ ایک تو ۱۹۷۸ء میں خوشبو پر آدم جی ایوارڈ ملا تھا جو پاکستان میں ایک قومی سطح کا اعزاز تسلیم کیا جاتا ہے، دوسرے ۱۹۸۵ء میں انہیں ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ برائے ادب دیا گیا جس کا اپنا ایک معیار اور وقار ہے۔ ۱۹۸۶ء میں انہیں یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ ان سب سے بڑھ کر فیض احمد فیض انٹرنیشنل ایوارڈ سے انہیں نوازا گیا جو ان کے شاعرانہ رتبے کے شایانِ شان ہے۔ پروین کو "پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ" بھی ملا جو حکومتِ پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔

وفات

۲۶/ دسمبر ۱۹۹۴ء کو پروین شاکر ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گئی۔ وہ صبح اپنی کار پر دفتر کے لئے روانہ ہوئی۔ کار ڈرائیور چلا رہا تھا، سامنے سے آنے والی بس نے ٹکر مار دی۔ ڈرائیور نے تو اسی لمحہ دم توڑ دیا۔ پروین شاکر کا سر پھٹ گیا اور دماغ باہر نکل آیا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا، ڈیڑھ بجے دن کے وہ انتقال کر گئی۔ مرنے سے پہلے 'فنون' شمارہ ۲۳۔۲۴ میں اس کی غزلیں شائع ہوئی تھیں ان میں ایک شعر تھا ؂

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

پروین کی ناگہانی موت پر ہندو پاک کے بے شمار ادباء و شعراء نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے تعزیتی خطوط لکھ کر اس کی قدر و منزلت کا اعتراف کیا۔ ہم یہاں کتابچہ 'خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر' کے حوالے سے کچھ ایسی شخصیتوں کے خطوط نقل کر رہے ہیں جن کی شعرو ادب اور فلم میں نہایت اہمیت ہے۔

سینیٹر اعتراز احسن

میں پروین شاکر کا ایک پرستار ہوں۔یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ پروین شاکر جیسی ایک خوبصورت اور خوب سیرت شاعرہ ہم سے بچھڑ گئی ہیں ۔انہوں نے کہا کہ میں نے پروین شاکر کی تمام شاعری پڑھی ہے۔وہ بہت منفرد شاعرہ تھیں ۔ان کی شاعری کی مثال ہمارے ادب میں نہیں مل سکتی۔پروین شاکر کو شاید اپنے چلے جانے کا علم تھا کیونکہ جب اس نے اپنی آخری کتاب 'ماہِ تمام' مجھے دی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے ابھی سے اپنا منتخب کلام کیوں شائع کر دیا،ابھی تمہاری بہت عمر باقی ہے تو پروین شاکر خاموش ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد کچھ سوچتے ہوئے بولی کہ زندگی کا کس کو یقین ہے اور کون جانتا ہے کہ اس نے کتنے سانس اور جینا ہے ۔اعتزاز احسن نے کہا کہ وہ زندگی کو برتنے کا سلیقہ جانتی تھی۔وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے ہارورڈ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ تھی اور وہاں ایک عرصے تک برصغیر کی شاعری پر لیکچر بھی دیتی رہی یعنی وہ ایک مکمل ترین عورت تھی اور اس کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے میں سمجھتا ہوں وہ بمشکل بھرے گا ۔

جناب احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کو مسقط میں اس جان لیوا حادثے کی خبر ملی انہوں نے ٹیلیفون پر سسکتے ہوئے کہا کہ میری سب سے پیاری بیٹی آج مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔قاسمی صاحب نے دکھ سے بوجھل لہجے میں کہا کہ پروین مجھ سے پیار کرتی تھی اور مجھے اپنا باپ کہا کرتی تھی لیکن وہ مجھے دھوکا دے گئی اور خاموشی کے ساتھ چلی گئی۔انہوں نے کہا کہ نا صرف وہ قلم قبیلے کی آبرو تھی بلکہ اردو شاعری کا حسن بھی۔انہوں نے کہا کہ" میں بہت بدقسمت ہوں آخری وقت میں اپنی بیٹی کا چہرا بھی نہیں دیکھ سکا۔"

جناب احمد فراز

احمد فراز نے پروین شاکر کی اندوہناک موت پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ آج اردو شاعری میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔انہوں نے کہا کہ پروین شاکر اپنے دور کی بڑی انسان تھیں۔اس نے خوشبو کے سفر سے اپنا آغاز کیا اور ماہِ تمام پہ یہ روشن آفتاب ڈوب گیا ۔احمد فراز نے رنجیدہ لہجے میں کہا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ نرم لفظوں میں گفتگو کرنے والی اور عزت و احترام کی علامت پروین آج ہمیں چھوڑ گئی ہیں ۔انہوں نے کہا کہ پروین شاکر کی شاعری اردو شاعری میں ایک نئی روایت تھی۔اس نے عورت کے خالص ترین جذبات

کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا کہ شاعری ایک انوکھا روپ اختیار کر گئی۔انہوں نے کہا کہ میں اس کی کس کس خوبی کی تعریف کروں۔وہ جامع صفات تھی۔اس کا لہجہ ،اس کی شاعری، اس کا رکھ رکھاؤ اور اس کی ذہانت' سب کچھ منفرد تھا۔وہ ایک بڑی عورت تھی اور بڑے لوگوں کی طرح اسے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔

انور مسعود

پروین سے چند روز پہلے میری ملاقات ہوئی۔وہ بہت اداس تھی۔میں نے اداسی کی وجہ پوچھی تو مغموم مسکراہٹ کے ساتھ بولی''آج کل میں زندگی کے بارے میں سوچ رہی ہوں،اس لئے دل خود بخود اداس ہو جاتا ہے۔'' اور میں اس ملاقات کے بعد کافی دیر تک پروین کے اس جملے پر غور کرتا رہا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔انور مسعود نے کہا کہ پروین کو مردہ نہ کہیں۔وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔وہ پورے پاکستان کی واحد شاعرہ تھی جس کی مثال دی جا سکتی ہے۔آج اس سانحے پر پاکستان کے قلم قبیلے پر کڑا وقت آن پڑا ہے۔

کشور ناہید

کشور ناہید نے روتے ہوئے کہا کہ آج میری بہن مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔انہوں نے کہا کہ جسطرح پروین شاکر گئی ہے جانیوالے اس طرح تو نہیں جاتے۔انہوں نے مزید کہا کہ یہ مہینے ہم پر بہت بھاری گئے ہیں۔پہلے ظہیر کاشمیری پھر احمد داؤد اور اب پروین شاکر ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔پروین میری بہت اچھی دوست تھی۔وہ میرے سامنے غزلیں لکھتی اور ان پر بحث کرتی۔مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرے سامنے یہ جو زخمی جسم پڑا ہے پروین شاکر کا ہے۔

ایاز ظہیر کاشمیری

پروین شاکر سے جدید اردو ادب کا سارا گلستان مہک رہا ہے۔وہ ان چند شاعروں میں سے تھی جن کو اس دور کی شعری دریافت کہنا چاہیے۔جذبے کی جس سچائی سے پروین نے اردو شاعری کے قارئین کے دل و دماغ کو متاثر کیا اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔وہ پاکستانی قوم کا سرمایہء افتخار تھی۔اس شخصیت کی ناگہانی موت پاکستان،اردو ادب اور سچ سے محبت کرنے والوں کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔اللہ تعالیٰ اسے جوارِ رحمت میں جگہ دے(آمین)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

جدید شاعری کا منظر نامہ پروینؔ شاکر کے دستخط کے بغیر نامکمل ہے۔

رفاقت گورایا

پروینؔ شاکر کی موت جدید اردو ادب کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے۔

عین تمبولوی

نوجوان شاعر عین تمبولوی نے کہا کہ پروینؔ شاکر کی شاعری ہم نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ تھی۔ان جیسی بڑی شاعرہ اردو ادب میں پیدا ہونا ناممکن ہے۔

محسن احسان

پروینؔ شاکر کو پڑھ کر مجھے ہمیشہ تازہ ہوا میں سانس لینے کا احساس ہونے لگتا ہے۔اس نے اردو شاعری کو نئے اسلوب اور خوبصورت جذبے سے روشناس کرایا ہے۔

ضمیر جعفری

وہ میری بیٹیوں جیسی تھی۔مجھ سے جب بھی ملتی اتنی محبت اور احترام سے پیش آتی کہ میرا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔میں نے جو رکھ رکھاؤ اور تہذیب پروینؔ کے ہاں دیکھی ہے وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی ۔میں تو یہ کہوں گا کہ میری پیاری بیٹی آج ہمیشہ کے لئے مجھ سے روٹھ گئی ہے۔

شبنم شکیل

شبنم شکیل جو میت کے پاس دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں انہوں نے بین کرتے ہوئے کہا کہ پروینؔ شاکر بہت خوبصورت تھی،اسے نظر لگ گئی ۔اس نے ہر مرحلے کو شکست دی تھی لیکن موت سے شکست کھا گئی۔وہ تو خاموشی کے ساتھ گزر گئی مگر ہمیں ویران کر گئی۔

راشد شاہین

پروینؔ شاکر صاف گو شاعرہ تھیں۔فہمیدہ ریاض کے بعد ان کی شاعری اردو ادب کی بہترین شاعری میں شمار ہوتی ہے۔وہ نوجوان نسل کی مقبول شاعرہ تھیں ۔ان کی وفات سے اردو ادب ایک بے مثال شاعرہ سے محروم ہو گیا۔

ملکہ ترنم نور جہاں

پروینؔ شاکر کی شاعری میں وہ ردھم ہے جو بڑے بڑے شاعروں کی شاعری میں ہوتا تھا۔ اس کی موت سے ہم ایک بہت بڑی شاعرہ سے محروم ہو گئے۔

اداکار محمد علی

پروینؔ شاکر کی موت اُردو ادب کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے۔

اداکار ندیم

دنیا ایک بڑی شاعرہ اور ایک اچھی قابل عورت سے محروم ہوگئی۔

اداکار بابر علی

مجھے ان کی ناگہانی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اُردو ادب ایک بہت بڑی شاعرہ سے محروم ہوگیا۔

اداکار نوید احمد

نوجوان اداکار نوید احمد نے بڑے دکھ سے کہا کہ پروینؔ شاکر کی اموت سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے نوجوان نسل میں ان کی شاعری کریز بن چکی تھی۔ میں خود ان کی شاعری سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

جان ریمبو افضل

پروینؔ شاکر کی موت ایک عہد کی موت ہے۔

سعود

ان کی موت سے اُردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ بلاشبہ وہ اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ تھیں۔

اس کے علاوہ ریما، نیلی، بابرہ شریف، صاحبہ، نیلو، نرگس، اداکار شان جاوید شیخ، سلیم شیخ نے پروینؔ کی وفات پہ گہرے دکھ اور غم کا اظہار کیا اور ان کی موت کو ناقابل تلافی نقصان کہا۔

بی بی سی کا تبصرہ

پروین کی موت کے بعد اسی رات بی.بی سی نے پروین شاکر کی اپنی آواز میں اس کا کلام کاسٹ کیا................ بی بی سی نے ان کی مکمل حیات اور شاعری پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے ان کو اُردو کی سب سے بڑی شاعرہ قرار دیا اور ان کے منفرد اسلوب پر انہیں اُردو ادب کی مہارانی قرار دیا۔ان کی شاعری ہر وقت خوشبو بکھیرتی رہے گی۔

علی سردار جعفری:

ہندوستان کے مایۂ ناز اُردو کے شاعر علی سردار جعفری نے جواں مرگ پروین شاکر کی شخصیت اور شاعری پر درد انگیز لفظوں کا سہارا لے کر آزاد نظم کی صورت میں ایک تہنیت آمیز نوحہ لکھا جسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

پروین شاکر

بہارِ حسن، جواں مرگ، صورتِ گل تر
مثالِ خار مگر عمر دردِ عشق دراز
وہ ودّیاپتی کی شاعری کی
معصوم و حسین و شوخ رادھا
وہ اپنے خیال کا کنہیا
ان شہروں میں ڈھونڈنے گئی تھی
دستور تھا جن کا سنگ باری

وہ فیض و فراق زیادہ
تقدیسِ بدن کی نغمہ خواں تھی
تہذیب بدن کی رازداں تھی
گلنار بدن کی تہنیت میں
گلنار لبوں سے گلفشاں تھی
لب آشنا لب غزل کے مصرعے

بسم آشنا بسم سمِ پیلر
لفظوں کی ہتھیلیاں حنائی
تشبیہوں کی انگلیاں گلابی
سرسبز خیال کا گلستاں
مبہم سے کچھ آنسوؤں کے چشمے
آہوں کی وہ ہلکی سی ہوائیں
'صدبرگ' ہوا میں منتشر تھے
تتلی تھی کہ رقص کر رہی تھی

اور درد کے بادلوں سے چھن کر
نغموں کی پھوار پڑ رہی تھی
پُر شور منافقت کے بازار
افواہیں فروخت کررہے تھے
وہ اپنی شکستہ شخصیت کو
اشعار کی چادروں کے اندر
اس طرح سمیٹنے لگی تھی
احساس میں آرہی تھی وسعت
نظروں کا اُفق بدل رہاتھا
اور دردِ جہانِ آدمیت
ٹوٹے ہوئے دل میں ڈھل رہا تھا
اس عالمِ کیف وکم میں اک دن
اک حادثے کا شکار ہو کر
جب خوں کا کفن پہن لیا تو
اڑتیں صلیبیں نوحہ خواں تھیں

خاموش تھا کرب 'خودکلامی'
اب کچھ نہیں رہ گیا ہے باقی
باقی ہے سخن کی دل نوازی

(۲)

جنت میں ہے جشنِ نو کا ساماں
محفل میں مجاز و بائرن ہیں
موجود ہیں کیٹس اور شیلی
یہ مرگِ جواں کے سارے عاشق
خوش ہیں کہ زمینِ پاک سے اک
نو مرگِ بہار آ گئی ہے
لپٹی ہوئی خاک کی ہے خوشبو
اور سایہ فگن سحابِ رحمت!

علی سردار جعفری نے اس نظم میں کچھ تلمیحات واستعاروں کی تشریح بھی کی ہے ان کے بقول:
ودیاپتی میتھلی زبان کا مشہور اور عظیم شاعر ہے۔اس نے اپنی شاعری میں کرشن اور رادھا کے عشق کا جشن منایا ہے۔اس کی نظموں کا انگریزی ترجمہ یونیسکو (UNESCO) سے شائع ہو چکا ہے۔بہار کی لڑکیاں عام طور سے اس کی شاعری سے واقف ہیں۔کرشن اور رادھا کے عشق سے فطرت کے سارے مظاہر ہم آہنگ ہیں۔اس کی شاعری کا ذرا سا اندازہ اس طرح کے اشعار سے ہوسکتا ہے

آئے ہیں سجن تو گھر میں من لگتا ہے
ہر چیز میں اک اپنا پن لگتا ہے
وہ دیکھ رہے ہیں مسکرا کر مجھ کو
اب میرا بدن میرا بدن لگتا ہے

کاجل جو لگا تو مسکرائیں آنکھیں
پلکوں پلکوں میں کنمنائی آنکھیں
جب شیام کے رنگ سے ہم آغوش ہوئیں
رادھا کی طرح سے جگمگائی آنکھیں

پروین شاکر کی شاعری میں 'گلنارلب' کی ترکیب مجاز کی یاددلاتی ہے۔اس نے پہلی بار اپنی نظم 'بتانِ حرم' میں یہ ترکیب استعمال کی تھی۔مراد 'دوشیزہ لب'.....................مرداورعورت کے احساسِ جسم میں جوفرق ہے وہ فراق وفیض اور پروین شاکر کی شاعری میں نمایاں ہے ......
.........اڑتیس صلیبیں پروین شاکر کی عمر کے اڑتیس سال ہیں۔اس کے پہلے مجموعے 'خوشبو' میں ایک نظم ہے جس کا عنوان 'بائیسویں صلیب' ہے۔اس میں اس نے اپنی عمر کے ۲۱ برسوں کو اکیس صلیبوں کے استعارے میں بیان کیا تھا۔یہ کتاب نومبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔اس کا دستخط کیا ہوانسخہ میرے کتب خانے میں ہے۔'صد برگ' اور 'خود کلامی' اس کے شعری مجموعوں کے نام ہیں۔

شخصیت

ہندوستان میں پروین شاکر کا طویل انٹرویو ہفت روزہ 'قومی آواز' ممبئی میں ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔یہ انٹرویو ممبئی کے جواں سال شاعر عبدالاحد ساز نے ناظم آباد کراچی میں لیا تھا۔اس انٹرویو میں عبدالاحد ساز نے بڑی تفصیل سے ایسے سوال پوچھے تھے جن کے جوابات پروین شاکر کی شعری شخصیت پر روشنی تو ڈالتے ہیں لیکن حالاتِ زندگی پھر بھی تشنہ طلب ہیں۔

عبدالاحد ساز نے لکھا تھا:

> ''پروین شاکر بلاشبہ اپنی شخصیت اورفن کے گہرے نقوش چھوڑ جانے والی ایک ایسی خاتون تھیں جسے قدرت نے حسن وجمال،علم وہنراورثروت ومنزلت سے ایک ساتھ نوازرکھا تھا۔اس نے شاعری اورفن سے ٹوٹ کر محبت کی اورخودبھی اپنے عہد کی شاعری کی آنکھوں کا تارابن کررہی۔''[1]

پروین شاکر نہایت حسین وجمیل خاتون تھی۔اس کو اللہ نے نسوانی حسن کے ساتھ ساتھ ذہانت دی،شعرگوئی کا ملکہ دیا اورنسوانی جذبات کے اظہار پرقدرت دی تھی۔پروین شاکر بے حا

---

[1] سہ ماہی اسباق۔فروری ۹۵ء

مہذب، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی۔جب کبھی اس سے کوئی غیر شائستہ بات ہوجاتی تو اپنے آپ کو کافی کوستی رہتی کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔اسے اپنے آپ پر غصہ آتا،اپنے آپ کو ڈانٹتی اور دوبارہ ایسا نہ کرنے کا ارادہ کرلیتی۔اپنی نرم مزاجی کے باعث دھیمے لہجہ میں بات کرتی جس میں غصے کا شائبہ نہ ہوتا لیکن جب وہ اپنے آپ کو حق بات پر محسوس کرتی تو لہجہ اونچا ہوجاتا اور غصہ بھی آجاتا لیکن یہ غصہ تادیر نہ رہتا۔زبان درازی اس کی فطرت میں شامل نہیں تھی۔ پروین شاکر کا اندازِ گفتگو بہت سمپل ہوتا وہ اپنی گفتگو میں مشکل اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا ''میں جو ہوں وہی ہوں ویسے ہی سامنے رہنا چاہتی ہوں۔''

اکیلے واک کرتے وقت وہ اکثر اپنے آپ سے باتیں کرتی۔اس کا خیال تھا کہ انسان کے اندر کچھ تلخی ہونی چاہیئے لیکن خود اس میں تلخی نہیں تھی اس بات پر وہ افسوس بھی کرتی۔وہ اپنے آپ کو بالکل نارمل نہیں سمجھتی تھی۔اس کے خیال میں کوئی بھی شاعر نارمل نہیں ہوتا۔اگر یہ پاگل پن نہ ہوتا تو نہ کوئی شیکسپیئر پڑھتا نہ مسجد قرطبہ، اس لئے وہ معاشرے میں کچھ لوگوں کا ابنارمل ہونا ضروری سمجھتی تھی۔جو لوگ چلتے پھرتے گھومتے شعر لکھ لیتے ہیں،اس پر اسے حیرت ہوتی اس لئے کہ وہ خود ایسی نہیں تھی۔ وہ اپنے پاس ایک چھوٹی ڈائری رکھتی تھی جب کوئی جملہ یا شعر فلیش ہوجاتا تو نوٹ کرلیتی تھی۔

پروین شاکر کی پسندیدہ ادا 'خاموشی' تھی لیکن اس میں SENSE OF HUMOUR اس کے لئے زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کا ذریعہ بھی تھا۔

> ''پروین شاکر کی شخصیت میں خود اعتمادی پائی جاتی ہے اور جس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں بھی موجود ہیں۔اسی کے سہارے انہوں نے زندگی میں ہر طرح کی مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔سر ہمیشہ اونچا رکھا ہے اور گیت بننے اور خوشبو پھیلانے میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی۔سترہ اٹھارہ برس کی مدت میں ان کے چار مجموعوں کی اشاعت اس کا بین ثبوت ہے۔'' [1]

پروین شاکر زندگی کو زندگی کی طرح جینا چاہتی تھی لیکن اسے وہ خوشیاں میسر نہ

---

[1] ماہنامہ شاعر شمارہ نمبر ۱۲ از آفتاب احمد صفحہ ۱۷

ہوئیں جس کے اس نے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خوابوں کے ٹوٹنے کے باعث اس کی شخصیت میں اداسی کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ذات سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتی ہے:

> ''مجھے اداس رہنے کا تو کوئی شوق نہیں لیکن اگر زندگی نے آپ کے ساتھ کوئی بہت اچھا سلوک نہیں کیا تو آپ نسبتاً اپنے ساتھ تو دیانت سے رہیں گے۔ میں اداس تو نہیں لیکن سنجیدہ ضرور ہوں۔ ایسی نہیں ہوں کہ میرے اندر مزاح کی حس نہ ہو۔ میں زندگی سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ حتیٰ کہ میرے دفتر میں بہت مختلف قسم کا کام ہے وہاں بھی اپنے لئے ریلیف ڈھونڈ لیتی ہوں۔ I ENJOY LIFE۔'' [1]

پروین شاکر فیملی پلاننگ کو ترجیح دیتی تھی۔ اس بات پر تو اس کا عقیدہ تھا کہ بے شک اللہ رزق دینے والا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ ان وسائل پر بھی نظر رکھتی تھی جو زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی سے اسے تشویش ہوتی۔ پروین کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ روز افزوں بچوں کی پیدائش سے بڑھتی ہوئی آبادی، ان کی فیڈ اور ہیلتھ کا مسئلہ، تعلیم اور روزگار کے مسائل کچھ ایسی باتیں تھیں جن کا حل نہ ہونے کے باعث پروین ان پر سنجیدگی سے غور کرتی۔

پروین شاکر خوشبو کی شاعرہ ہے لیکن ہمہ وقت خوشبو سے مہکتے رہنا اور ایک ہی خوشبو پر قناعت کر لینا اسے منظور نہیں تھا۔ وہ خوشبو بہت کم لگاتی اور وہ بھی بہت ہلکی، خوشبو لگانے میں بھی موسم اور وقت کا بہت خیال رہتا تھا۔ صبح اور شام کی خوشبوئیں وہ مختلف استعمال کرتی تھی۔

پروین شاکر مترنم شاعرہ نہیں تھی۔ ایک بار کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ ایک بہت اچھی مقرر بھی تھی اور شعر بھی کہتی تھی لیکن اس نے دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ضروری سمجھا اس لئے کہ تقریر اور شاعری دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ وہ کہا کرتی کہ تقریر انسان کو ہجوم کی طرف لے جاتی ہے اور شاعری تنہائی کی طرف۔ چونکہ پروین شاکر تنہائی پسند تھی اس لئے شاعری کی طرف آ گئی۔ تنہائی کو وہ ایک ایسی چیز سمجھتی تھی جس کے حوالے سے انسان

اپنے آپ سے ملتا ہے لیکن یہ حوصلہ مندوں کا کام ہے۔فنکار کے لئے اس کا خیال تھا کہ اسے پہلے اپنے آپ سے ملنا چاہئے۔

پروین شاکر کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔اس کے ذاتی کتب خانے میں پانچ ہزار کے قریب کتابیں ہوں گی۔اس کو بے شمار کپڑے اور زیورات پہننے کا شوق نہیں تھا اور نہ وہ کوئی بڑی پراپرٹی کھڑی کرنا چاہتی تھی۔

خوشی کا تصور:

پروین کے لئے خوشی کا مفہوم بہت مشکل ہے لیکن اتنا ضرور سمجھتی ہے کہ خوشی وہ ہے جو زندگی کو WORTH LIVING بنا دے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو پوری زندگی کا PROSPECTUS ہی بدل دیتی ہے۔

محبت کے بارے میں خیال:

پروین کی نظر میں محبت یہ ہے کہ جب انسان خود کو کسی کے بغیر ادھورا یا نامکمل محسوس کرنے لگے اور اس کا دل چاہے کہ اس سے اپنے دل کی ہر بات کہہ ڈالے تب محبت ہوتی ہے۔

عشق کے بارے میں خیال:

عشق کے بارے میں بھی پروین کا نقطۂ نظر اوروں سے مختلف ہے۔وہ عشق کو صرف عورت اور مرد ہی کے درمیان تصور کرتی ہے۔کسی ایسی شخصیت سے جو اساتذہ جیسے زمرے میں شمار کئے جاتے ہوں ان سے عشق نہیں ہوتا بلکہ عقیدت ہوتی ہے۔اس سوال پر کہ عشق ایک دم ہوتا ہے یا GROW کرتا ہے؟ پروین کا جواب یہ ہے کہ "یہ تو کسی شخص پر منحصر ہے۔کچھ لوگوں کے ساتھ آپ ایک عرصے سے رہ رہے ہیں اور آپ کو پتہ نہیں چلتا ہے کہ آپ کو ان سے عشق ہے اور بعض اوقات THUNDER AND LIGHTING والا معاملہ ہوتا ہے لیکن زیادہ تر پہلے والا کیس ہوتا ہے۔

پروین شاکر کے نقطۂ نظر سے عشق میں عشق کا اظہار ایسے ہی ضروری ہے جیسے خوشبو کا ہونا کوئی جواز رکھتا ہے۔دو شخصیتوں کے درمیان ان کے مراسم کی نوعیت خود ہی اس STAGE تک پہنچ جاتی ہے کہ جب محبت میں خاموشی ہی ذریعۂ اظہار بن جاتی ہے۔انسان اظہارِ عشق کیوں کرتا ہے اس لئے کہ جواب میں بھی عشق کیا جائے یا عشق کرنا ہی ایک مکمل عمل ہے؟ اس

سوال کے جواب میں پروین کا خیال ہے کہ "دیکھئے آدمی تھوڑا بہت تو چاہتا ہے کہ جواباً اس سے بھی ایسا ہی اظہار ہو۔ میں بالکل نہیں مانتی نہ اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ آپ تنہا یا ایک طرفہ اظہار کئے جائیں۔ شاید ایسا پرانے زمانے کی داستانوں میں ہوتا ہوگا اب تو نہیں ہوتا۔ اس میں بھی آپ کو یہ دیکھنا چاہئے کہ آپ کی ڈیمانڈ کہاں تک ہے، دوسرے آدمی کا دم تو نہیں گھٹ رہا۔"

پروین شاکر کے پاس عشق کا پیمانہ یہ ہے کہ دو عشق کرنیوالے آپس میں کتنے بے لوث ہیں۔ ایک دوسرے کا کتنا دھیان رکھتے ہیں اور اپنے مفادات کو کس حد تک ثانوی تصور کرتے ہیں۔ عشق ناپنے کا پیمانہ صرف قربانی ہی کو مان لیا جائے تو اس میں یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ آپ دوسرے کے لئے کیا قربان کر سکتے ہیں۔

عشق کا معیار:

عشق میں معیار سے متعلق پروین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان جب کسی سے عشق کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی معیار ضرور ہوتا ہے۔ کوئی ایسا امیج جس سے انسان محبت کرتا ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے لیکن یہ اتفاق کی بات ہے کہ انسان کا مطلوبہ معیار اسے کہیں مل جائے مگر ایسا کم ہوتا ہے۔ مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ آدمی تلاش میں ہی رہتا ہے۔

عشق میں ایڈجسٹمنٹ:

پروین شاکر عشق میں مایوسی کو TACKLE کرنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ اس بات سے اسے انکار نہیں کہ DISAPPONTMENT تو ہوتی ہے لیکن جس شخص سے عشق میں مایوسی ہو اسے اس لئے گوارا کر لینا چاہئے کہ وہ شخص انسان ہے کوئی فرشتہ نہیں اور جس سے غلطی کے امکانات تو بہر حال ہیں۔ غلطی کے علاوہ دوسری نیگٹو چیزیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کے لئے بھی پروین یہ سوال اُٹھاتی ہے کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ جب کوئی کسی کے ساتھ محبت کرتا ہے تو اس کی ذات سے محبت کرتا ہے یا اس کی صفات سے۔ اگر یہ طے ہو جائے تو مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں۔ پروین صاف اور دوٹوک فیصلہ کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ صفات تو ختم ہو سکتی ہیں، بدل سکتی ہیں، ان میں تبدیلی آسکتی ہے مگر ذات تو وہی رہتی ہے۔ جب کوئی کسی کو اس کی تمام تر منفی و مثبت صفات کے ساتھ قبول کرتا ہے تو پھر وہ ایسی چیزوں کی طرف جاتا ہی نہیں۔ اس صورت میں مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جن لوگوں میں عشق ایک عادت بن جاتی ہے تواس کی وجہ پروین یہ بتاتی ہے کہ جب انسان عشق میں شکست کھاجاتا ہے یااسے مایوسی ہوجاتی ہے تب بھی ممکن ہے اس عشق کی تھوڑی سی رمق اس کے دل میں موجودرہ جائے اورکہیں سے اسے تھوڑابہت مصنوعی تنفس بھی مل رہاہواوروہ مکمل طورپرختم نہ ہواہوتو عاشق اپنے معشوق کی جھلک اوروں میں تلاش کرنے لگ جاتاہے۔دراصل ایک ہی شکل میں گھومتے رہنااوراس سے باہرنہیں نکلنااسی کوعشق کی عادت کہاجاسکتاہے۔

پروین شاکرعشق میں PHYSICAL BEAUTY کوبہت زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ خوبصورتی بجائے خودبہت اچھی چیزہے مگرعشق میں خوبصورتی ثانوی ہوجاتی ہے۔پروین شاکر خوبصورتی کوصرف جسمانی یاچہرے کی خوبصورتی تک محدودکردینے کوزیادتی تصورکرتی ہے اس لئے وہ خوبصورتی کاکوئی معیارنہیں پیش کرتی۔جوچیزایک ضمنی ہووہ سب کیلئے قابل قبول ہویہ ضروری بھی نہیں اسلئے کہ ایک چیزجوکسی کے لئے خوبصورت ہووہ شایددوسرے کے نزدیک نہ ہو۔

نظریۂ شعروادب:

تخلیق شعروادب کوپروین شاکرایک اہم ترین فعل تصورکرتی ہے۔ادبی تخلیق کے مشغلے سے متعلق اس کاخیال تھاکہ شاعرجواپنی تخلیق سپردقلم کرتے ہیں وہ یونہی بے کاری کامشغلہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے تخلیق کارکوذہنی آسودگی ملتی ہے یہ بجائے خودایک بڑااہم کام ہے۔اپنی تخلیقات کی اہمیت سے متعلق پروین شاکرایک دلچسپ واقعہ بیان کیاہے جوقابلِ ذکرہے۔ ہوایوں تھاکہ جس وقت پروین شاکر کراچی کسٹم ہاؤس میں تعینات تھی تواسے فیصل آبادڈسٹرکٹ جیل سے ایک قیدی کاخط آیاجسے موت کی سزا ہوچکی تھی اورشایداس نے اس سلسلے میں صدرِمملکت سے اپیل بھی کی تھی۔اسے اتنایقین نہیں تھاکہ وہ بچ جائے گا۔اس قیدی نے اپنی ساری سچویشن بیان کرتے ہوئے پروین کولکھاتھاکہ مرنے سے پہلے وہ پروین کی شعری تصنیف پڑھناچاہتاہے۔عام طورپرپروین خطوط کے جوابات نہیں دیاکرتی تھی لیکن اس نے اس خط کاجواب دیاتولکھاکہ:

''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کس کیس کے تحت اندرہوئے اوریہ صحیح بھی تھاکہ نہیں لیکن مرنے سے پہلے آپ کی جوخواہش ہے

اسے پورا کرنے کے لئے ایک کتاب بھیج رہی ہوں۔" [1]

کتاب قیدی تک پہنچانے کے لئے درمیان میں ایک اے۔ایس۔پی تھا جس سے رابطہ قائم کرکے پروین نے اپنی کتاب اس تک پہنچائی اور یہ کتاب اسے مل بھی گئی جس کی پروین کو انتہائی خوشی ہوئی کہ دنیا سے گزرنے سے پہلے اس قیدی کی جو خواہش تھی اسے پروین نے پورا کیا۔

شاعرات کے شعری رویے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروین نے کہا تھا:

"شاعری اپنے ماحول اور زمین سے پھوٹتی ہے۔ہمارے یہاں میرا بائی کی روایت تو تھی جہاں عورت شعر کہتی ہے اور اسے اپنے عورت ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے اور وہ اپنے محبوب کی شخصیت ،اس کے لباس، اس کے مزاج،اس کے طور طریقے سبھی کچھ شعر میں بیان کرتی ہے۔یہ بات آپ کو دکنی شاعری میں بھی ملے گی۔" [2]

پروین نے تسلیم کیا تھا کہ:

"محبت اس کی شاعری کا مرکز ہے لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے اور مشاہدات کی نوعیت بدلتی ہے تو محبت کا استعارہ سارے معاشرے ،ملک بلکہ ساری دنیا کو اپنی معنوی تہوں میں سمیٹ لیتا ہے۔" [3]

پروین کی شاعری میں بار بار پھول،رنگ،خوشبو،تتلی،ہوا،بارش،شام کی لالی،رات، جگنو اور چاند کا ذکر ہوا ہے اور یہ سب محبت کے حوالے کے طور پر آئے ہیں۔غزل کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ:

"غزل تو امکانات کے معاملے میں اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں۔ غزل نے ہر صدمہ سہا اس کے باوجود جانبر ہو کے رہی۔" [4]

شعروادب میں نظریاتی اعتبار سے ادبی حلقوں کا وجود ناگریز ہے۔اس موضوع پر پروین شاکر نے

1. خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر صفحہ نمبر ۳۷
2. سہ ماہی اسباق،فروری۔ستمبر ۹۵ صفحہ ۵۱
3. سہ ماہی اسباق ایضاً صفحہ ۵۲

اظہارِ خیال کیا کہ:

''ایک تو قاسمی صاحب (احمد ندیم قاسمی) کا گروپ ہے اور دوسرا ڈاکٹر وزیر آغا کا گروپ ہے اور ایک فیض صاحب کا گروپ ہے جو دونوں میں اوور لیپ کرتا ہے۔ کیونکہ میں نہیں مانتی کہ جو صاحب قاسمی صاحب کے گروپ میں ہو وہ یہ کہے کہ میں کسی طور پر بھی فیض صاحب کو مانتا ہی نہیں، یہ احمقانہ سی بات ہوگی۔ یہ میجر گروپس ہیں اس کے علاوہ چھوٹے پاکٹس ہیں جو ادھر اُدھر چلتے رہتے ہیں۔'' [1]

احمد فراز کو پروین شاکر ایک اچھا شاعر تسلیم کرتی تھی اور عوام وخواص میں اس کی یکساں مقبولیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔

پیش رو شاعرات سے استفادہ: اُردو کے شعری ادب میں شعر کہنے والی عورت کے رول کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروین نے کہا تھا:

''شعر کہنے والی عورت کو اُردو معاشرے نے آہستہ آہستہ اب قبول کیا ہے۔ ہماری شاعری میں شاعرات کی روایت کچھ زیادہ نہیں رہی ہے۔ جب ہم تاریخ ادب اُردو کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں کچھ مثالیں ضرور ملتی ہیں مگر ان میں اہم نام معدودے چند ہیں۔ پُرانے وقتوں کی بیشتر شعر کہنے والی عورتیں یا تو بیگمات اور شہزادیاں ہیں یا پھر ان کا تعلق بالاخانوں اور کوٹھوں سے ہے۔ یا وہ دیویاں ہیں یا گڑیاں ہیں۔ ایک جیتی جاگتی LIVING عورت ہمیں نہیں ملتی۔ یہ سانس لیتی ہوئی عورت ہمیں جدید اُردو شاعری میں دستیاب ہوتی ہے اداؔ جعفری کے ہاں۔ اداؔ جعفری سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے، پھر اس سلسلے کی کڑی ہیں پروین شاکر، فنا سید پھر کشور ناہید اور کشور ناہید کے ہاں تجربات بہت گوناگوں ہیں اور اظہار میں ایک انٹلیکچول سطح بھی ہے، اس کے بعد فہمیدہ ریاض ہیں اور فہمیدہ کے ہاں اظہار کی جرأت اور جسارت زیادہ ملتی ہے۔ ان

---

[1] خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر صفحہ نمبر ۴۸

کے ہاں کوئی INHIBITION نہیں ہے۔تو ظاہر ہے میں نے اپنی
ان پیش رو خواتین سے بہت کچھ سیکھا ہے۔جب میں نے شعر کہنے
شروع کئے تھے تو ان کی کتابیں آچکی تھی۔"[۱]

اپنی ہم عصر پیش رو شاعرات پر پروین شاکر کی یہ رائے بڑی ایماندارانہ ہے اوراس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کا بھی پروین نے بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔پروین نے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ:

"میرے ڈکشن میں کوئی روایتی رکھ رکھاؤ ہے تو وہ میرے اپنے مزاج
اور مطالعے کی وجہ سے ہے۔جب تک فنکار اپنے فن کے کلاسیکی
ورثے سے واقف نہ ہوگا اس وقت تک وہ اپنے فن میں تازگی
یا ندرت پیدا نہیں کرسکے گا۔"[۲]

الن فقیر اور نصرت فتح علی خان کا وہ بہت احترام کرتی تھی کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جو باہر جا کر دنیا کو کچھ دے آئے ہیں اور لوگ ان کا دیوانہ وار استقبال کرتے ہیں۔

شاعروں کی غربت کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ:

"معاشرے میں شاعر کو جائز حیثیت ملی ہی نہیں۔اسے تفریح کا سامان
بنادیا گیا ہے۔ اسے پوسٹ ڈنر آئیٹم کی حیثیت دے دی گئی مگر اس
کے بعد کچھ بھی نہیں۔اب تو شاعروں،آرٹسٹوں اور فنکاروں کو امپورٹ
کیا جاتا ہے جس کے لئے انٹرنیشنل مشاعروں کا اہتمام اور اس کے
علاوہ بھی دیگر تقاریب ہیں۔ کنیڈا،یو۔ایس،اور انگلینڈ وغیرہ کے
مشاعرے تو معمول بن گئے ہیں۔"[۳]

خود پروین نے بھی ان مشاعروں میں شرکت کی ہے۔

پسندیدہ سیاسی شخصیت:سیاسی شخصیات میں پروین شاکر کو ذوالفقار علی بھٹو بہت پسند تھے۔وہ انہیں ایک

۱۔ سہ ماہی اسباق۔مضمون:خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود از عبدالاحد ساز صفحہ ۴۸

۲۔ سہ ماہی اسباق۔مضمون:خوشبو کا سفر ختم ہوا از خلیل تنویر صفحہ ۵۲

۳۔ خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر صفحہ ۴۹

ایسی سیاسی شخصیت تصور کرتی تھی جس میں کرشمہ ہوتا ہے۔چونکہ لفظ پروین کی کمزوری رہے اس لئے وہ بھٹو کی تقریروں کی بہت تعریف کرتی تھی۔وہ اسے نئے خواب، نیادرس 'اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو' کی عملی تصویر نظر آتے تھے،لیکن یہ اس وقت تھا جب پروین شاکر صرف ایک اسٹوڈنٹ تھی،جب اس میں اتنا سیاسی شعور بھی نہیں تھا کہ ان کی پالیسیوں کو سمجھ بھی سکتی۔بعد میں جب پروین نے بھٹو کی شخصیت کا تجزیہ کیا تو اس نے ان میں کئی ایسی باتیں بھی دیکھیں جو نہیں ہونی چاہئے تھیں۔ پروین شاکر ان کی ایجوکیشن پالیسی سے قطعی متفق نہیں تھی۔فیکٹریوں اور کالجوں میں وہ فرق محسوس کرتی تھی۔ دونوں کو نیشلائزڈ کیا جانا اسے پسند نہیں تھا۔

باب دوم

پاکستان میں ہم عصر اُردو شاعری

جب کوئی قوم غلامی`یا ظلم واستحصال کی جارحانہ قوتوں کے خلاف جدوجہد کرتی ہے تو اس کے ادب میں بھی اس صورت حال کا انعکاس فطری ہوتا ہے۔اس لئے کہ ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ انسانی زندگی کے نشیب وفراز سے گزر کر اجتماعی حوادث وحالات کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور ادیب کی شخصیت کے حوالے سے ایک ارتقائی لہجہ اختیار کرتا ہے۔پاکستانی ادب میں بھی پاکستانی عوام کی سیاسی اور تہذیبی جدوجہد کے نقوش صاف اور روشن نظر آتے ہیں۔تقسیم ملک کے بعد مملکتِ پاکستان کی گذشتہ تینتس سال کی تاریخ کو ڈاکٹر قمر رئیس نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔[1] ابتدائی گیارہ سال کا زمانہ اقتصادی اور انتظامی مشکلات پر قابو پانے کا اور لاکھوں مہاجرین کو بسانے کا دور تھا درمیانی گیارہ سالہ زمانہ جو کم وبیش ایوب خان کی عسکری حکومت پر محیط ہے جسے پاکستان کی تہذیبی اور سیاسی وحدت اور شناخت کی جدوجہد کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔آخری گیارہ سالہ دور پاکستان کے ٹوٹنے اس کی نظریاتی بنیادوں کے بکھرنے اور انسانی حقوق اور جمہوری آزادیوں کی جدوجہد کے تیز تر ہونے کا زمانہ ہے۔کم وبیش ان تین ادوار میں پاکستانی معاشرہ ایک طرح کی بے چینی، عدم استحکام اور بے جہتی کے کرب اور اضطراب کا شکار رہا۔حکمراں طبقے نے اس کے ساختی یا جاگیردارانہ ڈھانچے میں کسی تبدیلی کو گوارہ نہ کیا۔

آزادی کے بعد قدیم روایات کے ساتھ تقسیمِ ملک کے نتیجے میں فسادات کے حادثات اور ہجرت کے صدمات پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کو وراثت میں ملے یہی وجہ ہے کہ پاکستانی شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری میں اولین غالب رجحان فسادات کے خلاف ردِعمل ،تقسیم کے بعد اقدار کی شکست وریخت،گزرے ہوئے زمانہ کا نوحہ اور ہجرت کے تلخ تجربے کی ترجمانی ہے۔اس دور کے شاعر وادیب ۱۹۴۷ء سے پہلے کی علمی وادبی فضامیں پروان چڑھے تھے۔۱۹۳۵ء کی نسل سے وہ ذہنی وجذباتی طور پر متاثر تھے۔ان کے ساتھ مل کر اس نسل نے معاشرتی خوشحالی کا اجتماعی خواب دیکھا تھا جو تقسیم ،فسادات اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے سماجی حالات میں چکنا چور ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد شاید شعراء کی امیدیں پوری نہ ہوئیں۔انہوں نے نئی مملکت کے جو

خواب دیکھے تھے ان کی شکستگی کے دل دوز منظر اس عہد کی غزل میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں:

کیا حماقت کی کہ گردِ راہ کے پیچھے پڑے
اس ظرف چلتے جدھر آثارِ منزل دیکھتے

احسان دانش

کس قدر تاریکیوں میں آگئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

احمد ندیم قاسمی

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض احمد فیض

یہ خوابوں کا نہیں بلکہ خوابوں کی شکست کا عہد تھا۔ نئے شاعروں نے خوابوں کی شکست کے المیے کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع قرار دیا۔ منیب الرحمٰن نے خواب کی شکست کے المیے کو متعدد نظموں میں اپنے شعری تجربے کا موضوع بنایا۔ مجموعہ "بازدید" کی پہلی نظم 'خواب' ہے۔ بارہ مصرعوں کی اس مختصر نظم میں خواب اور شکستِ خواب کے المیے کو ذاتی غم بنا کر پیش کیا گیا ہے:

راہِ مہتاب میں خوابوں کے پریشان سائے
آگہی بن کے یکایک رگِ جاں تک آئے
میں نے چاہا تھا انہیں واقفِ اسرار کروں
ایک ہی پل کے لئے مائلِ گفتار کروں
سردیٔ غم میں وہ شعلوں کی زباں بن جائیں
شمعِ خلوت کی فغاں بن جائیں
لے گئی بادِ سحر گاہ اُڑا کر ان کو

[illegible] ڈھونڈوں کہاں جا کر ان کو

کون سی شاخ سے پوچھوں میں نشیمن ان کا

ہر کرن بن گئی مسکن ان کا

وہ مجھے چھوڑ گئے اور میں تکتا ہی رہا

میں اکیلا تھا اکیلا ہی رہا!

(خواب: منیب الرحمٰن)

یہاں 'بادِ سحر گاہ' ملک کی آزادی کا استعارہ ہے جو 'خوابوں کے پریشاں سایوں' کو منتشر کرنے کا سبب ہے اور انجام کار وہ تنہائی جو خوابوں کی شکست کا لازمہ ہے۔

(جدید اُردو نظم۔ نظریہ و عمل عقیل احمد صدیقی ۳۵۵)

پاکستان کے ترقی پسند شعرا میں فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، فارغ بخاری انقلابی نظریے کے باوجود فنی اظہار میں کلاسیکی تھے۔ ایسی تحریک جس نے انفرادی مسائل کے بجائے اجتماعی مسائل کو موضوعِ تخلیق بنایا تھا بالکل روایتی انداز میں غزل کو بروئے کار لا رہی تھی۔ فیضؔ نے غزل میں کسی نئے رنگ کا اضافہ نہیں کیا بلکہ روایات کو سلیقے سے نئے اجتماعی شعور کے پس منظر میں ضرور پیش کیا لیکن چند باتوں کی تکرار و تواتر سے فیضؔ کی غزل بہت محدود ہوگئی۔ ڈاکٹر ممتاز الحق رقم طراز ہیں:

"فیض ترقی پسند غزل گو شاعروں میں سب سے اہم ہیں۔ وہ غزل کے مزاج شناس تھے۔ انہوں نے پُرانی علامتوں کو نئی معنویت عطا کی۔ ان کے یہاں کلاسیکیت اور سماجی حقیقت پسندی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔"[1]

فیض نے دستِ صبا، دستِ تہہ سنگ اور نقشِ فریادی کی غزلوں میں ماضی کے سرمائے سے روایت کا اکتساب کیا ہے۔ فیضؔ اپنے تمام ترقی پسندانہ نظریات کے باوجود روایتی شاعر ہیں۔ انہوں نے وہ تمام استعارے اور مخصوص علائم استعمال کئے ہیں جو صدیوں سے غزل میں مستعمل تھے:

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن

کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

---

[1] اُردو غزل کی روایات اور ترقی پسند غزل صفحہ ۱۸۳

احمد ندیم قاسمی پاکستان میں ترقی پسند غزل کا دوسرا ستون ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں جلال و جمال، محیط اور شعلۂ گل کافی مقبول ہوئے۔احمد ندیم قاسمی کا ابتدائی کلام اقبالؔ کے شعری و فنی تفکر کا رنگ رکھتا ہے لیکن بعد میں انہوں نے اپنی راہ خود نکالی۔ندیؔم کی غزلوں میں صرف ایک موضوع یا نعرے کی تکرار نہیں بلکہ حیات و کائنات اور انسانی زندگی میں ہونے والے نوع بنوع تغیرات کا عکس بھی نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔وہ اپنے گرد و پیش سے تاثرات اخذ کر کے انہیں فنی حسن عطا کرتے ہیں:

چاند جب دور اُفق میں ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

سر بچا لائے ہو لیکن یہ زیاں تو دیکھو
کتنا ویران ہے تا حدِ نظر منظرِ دار

آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے
جبریل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک

عام ترقی پسند شعرا کے یہاں اجتماعی فکر کی لے اتنی تیز ہوتی ہے کہ ذاتی احساسات و جذبات دب کر رہ جاتے ہیں ان کے برعکس ندیؔم کے یہاں ذاتی کرب و احساس کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ندیؔم نے زندگی کے دکھ درد دیکھے تھے اس لئے باوجود پیامی شاعر ہونے کے ان کے کلام میں واعظانہ انداز نہیں۔کلام میں درد و کسک کی چاشنی ہے اور معنویت کی عظمت ہے ان کی غزلوں میں تغزل بھی ہے اور بے ساختگی بھی،خوبصورت تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں۔جدتِ فکر اور ندرت اظہار نے ان کی غزل میں بڑی رنگا رنگی پیدا کر دی ہے۔

ظہیر کاشمیری اس دعوے کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے کہ ان کے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے حوصلوں کی شاعری ہے محض حسنِ بیان کو منزل قرار نہیں دیتی۔ان کی شاعری میں جو شعوری توانائی اور منفرد لب و لہجہ ہے اس میں ان کے سماجی شعور کو بڑا دخل ہے۔ان کو طوفانی لہروں کے جلال و جمال کا شاعر کہا گیا ہے۔ظہیر کاشمیرؔی کے چار مجموعے عظمتِ آدم،تغزل، چراغ آخرِ

شب اور رقص جنوں شائع ہو چکے ہیں:

ہمیں پتہ ہے کہ ہم ہیں چراغ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

خود اپنی محبوب ادا سے قفلِ خموشی کھولے گا
اے دل تم مایوس نہ ہونا پتھر کا بت بولے گا

کیا خوب ارتقائے چمن کا اصول تھا
ہر شاخ گل صلیب تھی ہر گل رسول تھا

قیام پاکستان کے فوراً بعد ترقی پسند شعرا کے شانہ بشانہ ایک دوسرا طبقہ بھی تخلیق غزل میں مصروف تھا۔اس طبقے کے شعرا کسی نظریے اور کسی تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ان شعرا میں عابد علی عابدؔ، حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدمؔ، احسان دانش، سیماب اکبرآبادی، جلیل قدوائی، صوفی غلام محمد مصطفیٰ تبسمؔ اور ماہر القادری وغیرہ شامل ہیں۔یہ تمام شعرا اپنی ہی دنیا کے شاعر تھے اور روایت پرستی جن کا رویہ تھا۔ان شعرا نے لسانی و ہیئتی سطح پر کوئی جرأت مندانہ قدم نہیں اُٹھایا تھا۔اس گروہ کی جدت پسندی میں توازن اور متانت ہے جو یقیناً اس زندہ اور فعال تسلسل سے عبارت ہے جسے روایت کا نام دیا جاتا ہے۔اپنی زبان، ادبی ہیئتیں، اصول، تراکیب، رسومات اور وہ مختلف تہذیبیں جن کا تعلق ماضی سے ہے روایت کا حکم رکھتی ہیں۔

پاکستان کی اہم تحریکات میں حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک، ادب اسلامی کی تحریک، پاکستانی ادب کی تحریک اور ارضی ثقافتی تحریک کے اثرات کسی نہ کسی صورت غزل کی دنیا میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا میں ن۔م۔راشد، میرا جیؔ، یوسف ظفرؔ اور قیوم نظرؔ اہم ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ن۔م راشد اصلاً نظم کے شاعر ہیں۔ان کے مجموعۂ کلام ایران میں اجنبی، میں چند غزلیں شامل تھیں جو دوسرے ایڈیشن میں نکال دی گئیں۔حلقے کے دوسرے اہم شاعر میرا جیؔ ہیں۔میرا جیؔ نے غزلیں بھی کہیں۔انہوں نے غزل کو ایک کنواری عورت کے مماثل قرار دیا تھا اور اس عورت سے انہوں نے بڑی ملائمت سے گفتگو کی۔ان کی غزلوں میں بھی گیتوں کی سی چاشنی ہے:

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا راستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

مختار صدیقی (مجموعہ منزل شب) کی نمایاں خصوصیت خیال واسلوب کی جدت ہے انھوں نے ہندی کے الفاظ اور میر کی بحروں کا بڑا خوبصورت سنگم پیش کیا ہے۔

قیوم نظر (مجموعے سویدا، قندیل) یوسف ظفر (مجموعے نوائے ساز، زہر خند، عشق پیچاں) کی غزلیں صاف ستھری اور روایتی اسلوب کی غزلیں ہیں۔

پاکستانی ادب کی تحریک کے علم برداروں میں ڈاکٹر صمد شاہین، ڈاکٹر جمیل جالبی، ممتاز شیریں، سجاد باقر رضوی، سلیم احمد، انتظار حسین، ناصر کاظمی اور احمد مشتاق تھے۔ چونکہ یہ تحریک ترقی پسند تحریک کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی اس لئے ترقی پسند تحریک پر پابندی لگی تو یہ بھی ختم ہوگئی۔

ارضی ثقافتی تحریک کوئی باقاعدہ منظم تحریک نہیں تھی۔ وزیر آغا اور رسالہ 'اوراق' اس تحریک کے روح رواں ہیں۔ ارضی ثقافتی تحریک نے زمین کے وسیلے سے نہ صرف ثقافتی عناصر کو قبول کیا بلکہ اجتماعی لاشعور کو ایک ارضی رشتہ قرار دے کر ادب اور فکر کی تشکیل میں نسلی اور روحانی سرمائے کو بھی ناگریز قرار دیا:

> ''پاکستان غزل میں ایک اہم رجحان ۱۹۵۸ء مارشل لاء لگنے کے بعد اپنی آواز کو دبانے کی کوششوں کے خلاف ظلم سے واسطہ پڑنے پر سامنے آیا چونکہ اس وقت پاکستانی عوام نے پہلی بار فوجی حکومت اور مارشل لاء کو گھر آنگن میں دیکھا اس لئے ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ فوجی حکومت کے خلاف کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرنا ممکن ہی نہ تھا۔''[1]

۱۹۵۸ء کے بعد پاکستانی شعرا میں تہہ داری بڑھی یہی جدیدیت کی بنیاد تھی اس عہد میں داخلیت پسندی زیادہ ہوئی غزل میں جدت پسندی انتہا کو پہنچی اور غزل کی لفظیات،۔، رموز وعلائم، خارجیت اور داخلیت

---

[1] غزل کے جدید رجحانات صفحہ ۲۳۱

کے تناسب میں ایسی رمزیت، تہہ داری اور مختلف الجہت پیچیدگی آئی کہ غزل کا نیا اسلوب سامنے آیا۔ پاکستانی عوام کا عدم اطمینان، اور ہجرت نے غزل کے دامن میں پناہ لی۔ اس عہد کی غزل میں منفی اور مثبت تجربات کا طویل سلسلہ ہے۔

حکومت اور اہلِ اقتدار کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم کے خلاف جنہوں نے صدائے احتجاج بلند کی وہ ادیب اور شعرا ترقی پسند مصنفین سے ذہنی اور جذباتی طور سے تعلق رکھتے تھے اس لئے حکومت نے ۱۹۵۴ء میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن پر پابندی لگادی۔ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، حبیب جالب اور حسن ناصر جیسے بے شمار ادیب حکومت کے عتاب اور قید و بند کی اذیتوں کا شکار ہوئے۔ حسن ناصر کو وحشیانہ ایذائیں پہنچا کر قید خانے میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

(معیار ۱۹۸۴ء۔ پاکستانی ادب میں احتجاج کی آواز صفحہ ۴۲۶)

فکر و اظہار کی آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ قرۃ العین حیدر اور بعض دوسرے ادیب پاکستان سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ قرت العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' میں اور شوکت صدیقی نے اپنے ناول ''خدا کی بستی'' میں پاکستان کے شہری معاشرے اور پاکستانی سماج کے پیچیدہ مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستانی تاریخ میں سامراجی طاقتوں اور فوجی حکمرانوں کا ہمیشہ تسلط رہا ہے جس کے باعث ادیبوں اور شاعروں کی فکر و اظہار کی آزادیاں سلب ہوتی رہی ہیں۔ اس دور کے ادب میں خوف، گھٹن، عدم تحفظ، دہشت، ویرانی، تردد، بے یقینی اور اس کے خلاف غم و غصہ اور برہمی کا احساس نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ جمیل الدین عالی نے ایک دو ہے میں اس صورت حال کو بڑے مؤثر ڈھنگ میں پیش کیا ہے۔

تہہ میں بھی ہے حال وہی جو تہہ کے اوپر حال
مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال

کرب انگیز دہشت، خوف اور ویرانی کی فضا کو پاکستانی شعر و ادب میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ پاکستان کی اُردو شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اساسی موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں ظلم و تشدد سے نجات، سماجی انصاف اور جمہوری حقوق کی تڑپ ہیں۔ غزل گو شعرا نے بھی نئے شعری لفظیات، استعارات اور تشبیہات و علائم کا سہارا لیتے ہوئے اسی معاشرتی فضا کو خونچکاں انگلیوں سے لکھی ہوئی اُجالے کی تحریروں میں منتقل کردیا۔ یہی کیفیت اس عہد کی نظموں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، اعجاز راہی، احمد فراز، مصطفےٰ زیدی، شبنم رومانی، پروین شاکر، جون ایلیا اور دوسرے نوجوان

شعراوشاعرات کے کلام میں اپنے عہد کی متحرک تصویریں ملتی ہیں فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، ن۔م۔ راشد، عارف عبدالمتین اور عبدالعزیز خالد کی طرح نئی نسل کے شعرا بھی اگر ایک طرف اپنے اطراف اور معاشرتی سطح پر ہونے والے تغیرات وتبدل کے اثرات کو قبول کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ تیسری دنیا کی مظلوم انسانیت سے انصاف اور آزادی کے لئے ان کی جدوجہد سے اپنا رشتہ جوڑ کر حوصلہ خیز امکانات کی راہ دکھاتے ہیں۔

پاکستان کے غزل گوشعرا کے کلام میں بھی اس آشوب حیات اوران اجتماعی واردات کی جھلکیاں ملتی ہیں جن سے وہ معاشرہ دوچار رہا۔ بعض شعرا کے نظمیہ کلام میں ہجرت سے پیدا ہونے والے کرب محرومی اور ناسٹلجیا کی پُرعذاب کیفیات کثرت سے نظر آتی ہیں۔ نئی غزل میں بھی جس کا آغاز ناصر کاظمی سے ہوتا ہے، دل کی معتبر روایتوں کو ترجیح دینے کے باوجود خارجی حالات کے زیروبم کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کا عہد سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہجرت سے لے کر سیاسی تموج تک ہر سانحے، ہر واقعے کی لہریں ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ نوجوان شعرا کے کلام میں خارجی حالات کی لہریں نسبتاً زیادہ اور تیکھی ہیں:

اُجڑے ہوئے مکاں میں اندھیرے ہیں خیمہ زن
چاروں طرف ہواؤں کا سیلاب دیکھئے

دن ڈھل چکا ہے شہر کو اب ماہتاب دے
اے ذوالجلال ڈوبتی آنکھوں کو خواب دے

اعجاز راہیؔ

ہاں کشتگانِ جرأت انکار ہم بھی ہیں
یوں ہیں کہ اپنے عہد کا اقرار ہم بھی ہیں

حسن عابد

یوں تو اظہار غمِ دل کی اجازت ہے ہمیں
شرط یہ بھی ہے کہ پتھر کو بھی پتھر نہ کہیں

مرتضیٰ برلاس

یہی زمانہ تھا جب میرؔ کا اتباع ایک تحریک کی شکل میں کیا گیا۔اس تحریک کے شعرا کے گروہ نے جس کے سرخیل ناصر کاظمی تھے اس بات کا اظہار کیا کہ اس عہد کی رات میرؔ کی رات سے جا ملی تھی۔

پاکستانی جدید غزل کا ایک دلچسپ اور کامیاب رجحان ہندی الفاظ،علامتیں،دیومالائی اشارے،زبان والفاظ کی شکست وریخت،ہندی مزاج کے مطابق ہونا ہے۔ہندو دیومالائی اشاروں کی ابتدا میراؔجی نے کی تھی۔جدید غزل میں اس کا استعمال ۱۹۶۰ء کے بعد زیادہ نظر آتا ہے۔

پاکستان کی جدید غزل میں ایک اہم علامتی رجحان واقعۂ کربلا اور اس کے متعلقات کو بطور شعری استعارہ استعمال کرنے کا بھی ہے۔پاکستان میں احمد فراز،منیر نیازی اور لندن میں مقیم افتخار عارف نے بطور خاص اس استعارے کو اپنی شناخت بنایا۔

پاکستانی غزل میں ایک خوشگوار تجربہ نسائی لہجے کا ہوا۔اُردو غزل کی تاریخ میں شاعرات کی ایک طویل فہرست ہے۔شاعرات کو مردانہ لب ولہجے میں شاعری کرنا ہوتی تھی چونکہ ان کا اپنا انداز تو ریختی کو سونپ دیا گیا تھا۔اگر کوئی شاعرہ اپنے ہی لہجے میں شاعری کرتی تو قابلِ اعتنا نہ ٹھہرتی۔نسائی لب ولہجے کی شاعری کے کچھ نمونے آزادی سے قبل بھی نظر آتے ہیں لیکن یہ شاعری چند غزلوں تک محدود رہی اور رجحان نہ بن سکی۔

باب سوم

مجموعہ خوشبو

پروین کی شعری فکر میں فن اور اس کی نزاکتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس کی نظمیہ شاعری یہاں تک کہ غزلیہ شاعری میں بھی وحدت تاثر پایا جاتا ہے اور وحدتِ تاثر پیدا کرنے کیلئے سادگی، تحریر میں بے ساختگی ، روانی، عام فہم زبان، غیر ضروری آرائش سے اجتناب اور خیال کی صحت مندی ناگزیر ہیں۔ ''خوشبو'' کی بعض تخلیقات فن کی نزاکتوں، لطافتوں، خیال کی رعنائیوں؛ بیان کی رنگینیوں اور مناسب صنعتوں سے بجی ہوئی ہیں۔تخیل اور شعریت پر فکر و فلسفے کا غلبہ نہیں۔اپنے خیالات کے اظہار کیلئے پروین شاکر کو موزوں الفاظ اور مؤثر انداز بیان بآسانی مل جاتا ہے یہ اس کی زبان و بیان پر قدرت کی دلیل ہے جو قاری کے ذوق جمال کی تسکین کا باعث بنتی ہے اور خود فنکار کی تحریر میں تازگی، شگفتگی، رعنائی و دلکشی اور ندرت پیدا کر دیتی ہے۔ پروین شاکر کا غزلیہ اسلوب غنائی ہے۔اس کی تشبیہات و استعارات، اس کے اشارے و کنایے کبھی کبھی ہندی الفاظ کا استعمال ماحول اور موضوع کی مناسبت کے ساتھ جلال و جمال اور سبک روی اس کی غزلیہ شاعری کے اثر کو بڑھا دیتے ہیں۔

پروین شاکر کی تخلیقات کی فضا بھی رنگ و نور میں ڈوبی ہے کیونکہ وہ فطرتاً رومانی واقع ہوئی ہے۔اس نے جن جذبات و خیالات کی ادائیگی میں فن کا سہارا لیا ہے اس میں اخلاق، تہذیب و تمدن اور سماج مانع نہیں ہوتے۔اس کی شاعری میں فطرتِ انسانی کی عکاسی ملتی ہے۔ پروین نے انسانی نفسیات کے عشقیہ و جنسی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کا بیان رمزیت کے ساتھ لطیف پیرایے میں کیا ہے۔ ''خوشبو'' کے حوالے سے اس کی غزلیات جن موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں وہ معاملات عشق ،انتظار، وصل و فراق، تجدید وفا، خود اپنی ذات، تیسری ذات اور گھر آنگن ہیں۔ان موضوعات میں ایک خاص ربط و ضبط بھی ہے۔ شبنم بدست لوگ یعنی دوستوں کے برتاؤ اور سیاسی و سماجی مسائل کو بھی پروین نے اپنی غزلیات میں پیش کیا ہے۔

معاملاتِ عشق

خوشبو کے حوالے سے پروین کی شاعری میں معاملات عشق کی مختلف کیفیات لفظی

پیکروں میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔وہ تمام معاملات وکیفیات جن کا تعلق عشق سے ہے جیسے ابتدائے عشق، اظہار محبت، شکوہ وشکایت، ایک دوسرے سے خفگی وناراضگی جس کے نتیجے میں کبھی ایک طرفہ اور کبھی باہمی اجتناب ، رقابت کا جذبہ، وصل وفراق اور کبھی کبھی تیسری ذات کا تصور، یہ اور ایسے کئی مرحلے ہیں جو عشق کے سفر میں پیش آتے ہیں۔ پروین نے عشقیہ شاعری میں ان تمام مرحلوں کو پیش کیا ہے۔ لیکن اس کی یہ شعری انفرادیت ہے کہ اس کی شاعری میں حسن وعشق کا رشتہ محض دو متضاد جنسوں کا نہیں بلکہ اس کے بعد وہ مقام بھی ہے جہاں محبت صرف محبت نہیں رہتی بلکہ زندگی کی ضرورت بن جاتی ہے۔ پروین کی شاعری میں ازدواجی رشتوں کا انعکاس نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔اس کی شاعری میں جس عورت کا تصور ابھرتا ہے اس کے ساتھ معاملہ کچھ اس قسم کا بھی نہیں کہ عشق کسی اور سے رہا اور ازدواجی رشتوں میں منسلک کسی اور کے ساتھ رہی ہو۔ ہم نے پروین کی شاعری میں اس کے جس محبوب کے تصور کو ابھرتے ہوئے دیکھا ہے وہ اس کا وہی شریکِ حیات ہے جس سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتی ہے، کبھی کبھی تو قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پروین کی یہ محبت یک طرفہ ہو لیکن اس کے کلام سے اس بات کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ وہ جب ماضی کا ذکر کرتی ہے تب بھی اس کے سامنے وہی شخصیت ہوتی ہے جو پروین سے بھی بے انتہا محبت کرتی رہی ہے۔

اب ہم پروین کے شعروں کے حوالے سے ان معاملات کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں جن کا ذکر ہم اپنی ابتدائی سطور میں کر چکے ہیں ۔

کانپ اُٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
مرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

زباں سے چپ ہے مگر آنکھ بات کرتی ہے
نظر اُٹھائی ہے جب بھی تو بولتا ہی لگا

وہ سوتے جاگتے رہنے کے موسموں کا فسوں
کہ نیند میں ہوں مگر نیند بھی نہ آئی ہو

میں اس سے کھل کے ملوں سوچ کا حجاب اترے
وہ چاہتا ہے مری روح کا نقاب اترے

اور جب سوچ کا حجاب اور روح کا نقاب اتر جاتا ہے تو ۔

خط کو چوم کر اس نے آنکھ سے لگایا تھا
کُل جواب تھا گویا لمحہ بھر کا سناٹا

اور پھر ایسا وقت بھی آتا ہے جب اظہارِ محبت میں کوئی تکلف باقی نہیں رہتا ۔

کون چاہے گا تمہیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبت کرنا

مری طرح سے کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمہاری یاد کے نام انتساب کردے گا

اور پھر یہ بھی محبت کی انتہا ہی تو ہے کہ جب دو روحوں کے علاوہ اور کسی کی شرکت گوارا نہیں کی جاسکتی ۔

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اسرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ 'ذرا زُلف کھولئے'

اور پھر جیسا کہ عشق و محبت میں ہوتا آیا ہے کہ درد و غم اور ہجر و فراق دو چاہنے والوں کا مقدر بن جاتا ہے۔ وقت کے بے رحم ہاتھ ہونٹوں کی مسکان اور آنکھوں کی چمک چھین لیتے ہیں کچھ ایسی ہی کیفیات کی عکاسی ان شعروں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے ۔

کیا دُکھ تھے کون جان سکے گا نگارِ شب
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

بچپنے کا ساتھ ہے اور ایک سے دونوں کے دُکھ
رات کا اور میرا آنچل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

ایک ہی شہر میں رہ کر جن کو اذنِ دید نہ ہو
یہی بہت ہے ایک ہوا میں سانس تو لیتے ہیں

واقعات کے تغیر وتبدل میں دو چاہنے والوں کے کردار میں تبدیلی ہے، شک وشبہات اور ایک سمت میں نہ دیکھنے کا عمل بھی ہے۔ پروین کے شعروں سے یہ نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ معاملاتِ حسن وعشق میں اپنے آپ کو وفا شعار اور محبت کرنے والا کردار بنا کر پیش کرتی ہے۔ اس کے برعکس اس کے دوست کا کردار مشکوک اور ہرجائی پن کا ہے۔

بہت عزیز سہی اس کو میری دلداری
مگر یہ ہے کہ کبھی دل مرا دکھا بھی گیا

یاد سے نام مٹا ذہن سے چہرا اترا
چند لمحوں میں نظر سے تری کیا کیا اترا

نیند لاتا ہوا پھر آنکھ کو دکھ دیتا ہوا
تجربے دونوں ہیں وابستہ ترے ہاتھ کے ساتھ

میں برگ برگ اس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا

رنگ پھیلا تھا لہو میں نہ ستارا چمکا
اب کہ ہر لمس ترا جھوٹ رہا ہو جیسے

حرف کیوں اپنے گنوائیں جا کر
بات سے پہلے جہاں بات کٹے

منہ پہ چھڑکاؤ ہو اندر سے جڑیں کاٹی جائیں
اس پہ اسرار اسے عین محبت جانو

اپنے محبوب کو کھو کر بھی خلوت جاں میں اسے پانے کا عمل پروین کے شعری تخیل اور اس کی پرواز فکر نیز اس کی محبت اور وفا شعاری ذیل کے اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

تیری برہنہ پائی کے دکھ بانٹتے ہوئے
ہم نے خود اپنے پیروں میں کانٹے چبھو لئے

انگلیوں کو تراش دوں پھر بھی
عادتاً اس کا نام لکھیں گی

ہر رنگ میں وہ شخص نظر کو بھلا لگے
حد یہ کہ روٹھ جانا بھی اس شوخ پر کھلے

میں جب بھی چاہوں اسے چھو کے دیکھ سکتی ہوں
مگر وہ شخص کہ لگتا ہے اب بھی خواب ایسا

جو خواب دینے پہ قادر تھا میری نظروں میں
عذاب دیتے ہوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

تجھ کو کھو کر بھی رہوں خلوتِ جاں میں تیری
جیت پائی ہے محبت نے عجب مات کے ساتھ

یہ اور اسی قسم کے کئی ایسے اشعار ہیں جو معاملات عشق میں پروین کی یک طرفہ محبت کی گواہی دیتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس کا دوست اسے دکھ پہنچاتا ہے، اس کے جذبات کا احترام نہیں کرتا، اس کی انا کو مجروح کر دیتا ہے، پروین ہمہ تن اس کے انتظار میں ڈوبی رہتی ہے ۔

آنکھیں ہیں اور صبح تلک تیرا انتظار
مشعل بدست رات ترے نام ہوچکی

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا اس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر کرتے رہے

پروین کی شاعری میں ایک مستقل تشنگی کا احساس ہے۔دنیا کی ہر چیز اپنے مرکز پہ قائم ہے لیکن ہر شئے میں کسی کی کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ تشنگی سے متعلق ۔

وہ سمندر ہے تو روح کو شاداب کرے
تشنگی کیوں مجھے دیتا ہے سرابوں کی طرح

رگ رگ میں اس کا لمس اترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے

تمام عمر کی نا معتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں یقیں سے ملیں

پروین کی غزلیہ شاعری میں فکر و جذبے کی کشمکش بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ ایک ایسے شخص کی ہمسفر ہے جسے اس کا دل ٹوٹ کر چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے دوست کا برتاؤ رفاقت آمیز نہیں جس کے باعث اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب کشمکش پیدا ہو جاتی ہے ۔

دل اسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

یوسف حسین خان نے اپنی تصنیف ''اُردو غزل'' میں حسن اور عشق سے متعلق بطورِ خاص حسن پر عشق کی غالبیت اور تصرف کا ذکر کیا ہے لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ اس کی مطلوبہ شئے جب اسے اس حد تک میسر ہو جائے کہ وہ اس کی ملکیت بن جائے تو اس کو نہ پانے کی تشنگی جو اپنے آپ میں لذت ہوتی ہے، مٹ جاتی ہے اور پھر ایسی شخصیتوں کے ساتھ کہ جہاں محبت کی حدیں

ازدواجی زندگی کی سرحدوں سے مل جائیں اور محبت زندگی کی ضرورت اور روزمرہ کا تقاضہ بن جائے باہمی اجتناب کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ پروین جب یہ کہتی ہے ؂

دسترس سے اپنی باہر ہو گئے
جب سے ہم ان کو میسر ہو گئے

تو کیا یہاں وہ اس بات کا احساس نہیں دلا رہی کہ بعض اوقات محبت کا کامیاب ہو جانا بھی ایک طرح کی ناکامی ہے۔ اس کے باوجود پروین کی شاعری میں اس کے شریک حیات کا تصور ایک محبوب ہی کا تصور ہے کہ جن کے درمیان حسن اور عشق کے علاوہ کسی اور رشتے کا نام نہیں لیا جاسکتا چاہے اس کا دوست اس کے خیالوں سے کتنا ہی گریز کرے، اس کی صداؤں کو سماعت کا درجہ نہ دے اور اس سے متنفر رہے۔ پروین جب کبھی اپنی شاعری میں ایک عاشق کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی ہے اس کا مخاطب ہمیشہ وہی دوست رہا ہے ؂

وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا اس سے نہ بولوں

انتظار

پروین کی شاعری میں انتظار کی شدت اپنے کئی رنگوں اور کیفیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے جس کے باعث اس کی شاعری میں محبت کی ایک ایسی فضا تشکیل پاتی ہے جس میں خودسپردگی کا عالم نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ ایک ایسا انتظار جو پلکوں پہ ستارے روشن کر دے، گھر کا یہ عالم کہ در و دیوار سے بھی دوست کے دیدار کی حسرت ٹپک رہی ہے، دریچے نیم وا اور در کھلے ہوئے ہیں لیکن جس کا انتظار ہے وہ اپنے وعدے کے مطابق نہیں پہنچ پاتا۔ شاید ہی کبھی ایسا موقع آتا ہو جب دروازہ کھولنے پر اچانک محبوب سامنے کھڑا ہوا نظر آئے۔ جو شخص دن بھر کسی کا راستہ دیکھے یہاں تک کہ شام ہو جائے، آنکھیں دھندلا جائیں اور صبح کا بھولا شام کو بھی نہ لوٹے تو ظاہر ہے اس کا ردِعمل ہونا یقینی ہے۔

پروین اپنائیت کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں رہی۔ ایک ایسا دوست، ایک ایسا ساتھی جو اس کی تنہائیوں کو دور کر سکے، جو نہ صرف یہ کہ چاہے جانے کی آرزو کرے بلکہ اسے بھی چاہے، اس سے محبت اور پیار کرے، زندگی اپنے آپ میں نامکمل نہیں بلکہ مکمل ہو۔ کسی کے بغیر ادھورے

پن کا احساس پروین کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے۔کوئی ایسا ہے جسے وہ پسند کرتی ہے، چاہتی ہے لیکن جب محبت کی شاہراہ پر آمدورفت یک طرفہ ہوجائے تو داخلہ ممنوع ہوجاتا ہے۔کسی اپنے میں غیریت محسوس کرنا انتہائی اذیت ناک احساس ہے۔اسے ایک ایسے ہاتھ کی تلاش ہے جو اُس کی مانگ میں صندل بھر سکے۔پروینؔ جانتی ہے کہ وہ جس کا انتظار کررہی ہے وہ آنے والا نہیں لیکن انتظار کی تکلیف دہ ساعتوں کو بھی وہ مسرت وانبساط کا سامان بنالیتی ہے۔

بارہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

پروینؔ کو اپنے محبوب کا انتظار ہے اور شدید انتظار ہے۔وہ جانتی ہے کہ اگر اس کا محبوب آ بھی جائے تو اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو پورا نہیں کریگا۔اس کا یہ کہنا کہ

قریۂ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے
وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے

اس بات کی شہادت دے رہاہے کہ وہ اپنے محبوب کا قرب چاہتی ہے چاہے وہ جان لیوا ہی کیوں نہ ہو۔مذکورہ شعر جس غزل کا مطلع ہے وہ پوری غزل اسی آرزو کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے کہ اس کا محبوب آئے اور بہرحال آئے۔ذیل کے اشعار اس بات پر مستزاد ہیں ۔

رنگِ جوئندہ وہ آئے تو سہی
پھول تو پھول ہیں شاخیں اس کی

وہ جب آئے گا تو پھر اس کی رفاقت کیلئے
موسمِ گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا
بجتے رہیں ہواؤں سے در تم کو اس سے کیا

تمام رات مرے گھر کا اک در کھلا رہا
میں راہ دیکھتی رہی وہ راستہ بدل گیا

دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ
حیرت ہے مجھے آج کدھر بھول پڑے وہ

میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آکے مرے شہر سے چلا بھی گیا

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا اس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر کرتے رہے

کئی رُتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم

وہ ہواؤں کی طرح خانہ بجاں پھرتا ہے
ایک جھونکا ہے جو آئے گا گزر جائے گا

وصل و فراق

پروینؔ نے اپنے محبوب کے لئے جن جمالیاتی استعاروں کو منتخب کیا ہے ان میں چاند، آفتاب، ماہتاب اور ستارہ نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ اکثر ہجر کی راتوں میں جب اسے اپنے محبوب کا قُرب حاصل نہیں ہوتا تو وہ چاند ستاروں میں اس کے وجود کو محسوس کرتی ہے۔

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کے ہجرِ کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی

وصل کی اپنی لذّت ہے اور ہجر کی اپنی جداگانہ لذّت ہے لیکن پھر بھی جدائی بہر حال جدائی ہے

کہ جس کے بعد ہجر کی اذیت ناکی اپنا رنگ دکھاتی ہے اور جدائی کا منظر آنکھوں میں ٹھہر سا جاتا ہے۔ پروین نے اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کچھ سوال بھی اُٹھائے ہیں اور پرسوز لہجہ میں جدائی کی کیفیات کو بھی پیش کیا ہے ۔

دُعا کا ٹوٹا ہوا حرف سرد آہ میں ہے
تری جدائی کا منظر ابھی نگاہ میں ہے

ہجر کے پانیوں میں عشق کی ناؤ
کہیں غرقاب ہو گئی شاید

کوئی سوال جو پوچھے تو کیا کہوں اس سے
بچھڑنے والے سبب تو بتا جدائی کا

ہم نے خود سے بھی چھپایا اور سارے شہر کو
تیرے جانے کی خبر دیوار و در کرتے رہے

ریل کی سیٹی میں کیسے ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا

ہجر میں تاریک راتیں تو تاریک ہوتی ہی ہیں لیکن جب آسمان پر چاند دکھائی دینے لگے تو جدائی کا درد دوبالا ہو جاتا ہے ۔

پورا دکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند

دن ٹھہر جائے مگر رات کٹے
کوئی صورت ہو کہ برسات کٹے

چاند آ مل کے منائیں یہ شب
آج کی رات ترے ساتھ کٹے

موسم کا عذاب چل رہا ہے
بارش میں گلاب جل رہا ہے

ہجر کی شب مری تنہائی پہ دستک دے گی
تری خوشبو مرے کھوئے ہوئے خوابوں کی طرح

ہجر کے برعکس وصل میں ذہنی کیفیات اور دلی جذبات کا انعکاس بھی پروین کے آئینۂ فکر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ظاہر ہے وہ شخصیت جس نے ہجر کے شب وروز تڑپ تڑپ کر گزارے ہوں وصل کی گھڑیاں اس کے لئے جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے مترادف ہیں جس کی تاثیر روح تک پہنچ جاتی ہے ۔

وصل میں تیرے خرابے بھی لگیں گھر کی طرح
اور تیرے ہجر میں بستی بھی ویرانہ ہمیں

اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اک رات کھلا تھا اس کا وعدہ
آنگن میں ہجوم خوشبوؤں کے

سوتی رہی آنکھ دن چڑھے تک
دلہن کی طرح تھکن سمیٹے

دو دوستوں کی ملاقات میں اگر واقعی خلوص اور محبت کا جذبہ کارفرما ہو تو وصل یقیناً زندگی کا آئینہ دار

بن جاتا ہے وصل تو کیا ہجر تک بھی وصل کی ہم رنگیوں سے سرشار کر دیتا ہے لیکن جذبۂ محبت اور خواہش وصل یک طرفہ ہو تو ذہن و جسم مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

جو صرف روح تھا فرقت میں بھی وصال میں بھی
اسے بدن کے اثر سے رہا تو ہونا تھا
گئے دنوں میں جو تھا ذہن و جسم کی لذّت
وہی وصال طبیعت کا جبر بننے لگا

رنگ پھیلا تھا لہو میں نہ ستارا چمکا
اب کے ہر لمس ترا جھوٹ رہا ہو جیسے

ملنے سے گریزاں ہے نہ ملنے پہ خفا بھی
دم توڑتی چاہت ہے کس انداز کا رشتہ

رنگ خوشبو میں اگر حل ہو جائے
وصل کا خواب مکمل ہو جائے

ہم پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ پروین کے یہاں عشق یک طرفہ دکھائی دیتا ہے۔اس کا دوست اس کے جذبات واحساسات کا احترام اتنا نہیں کرتا جتنا کہ پروین کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔وہ پرسشِ حالات کرے یا نہ کرے لیکن پروین اپنے دوست کے لئے فکرمند ضرور رہتی ہے ۔

وہ مجھ سے دور خوش ہے؟ خفا ہے؟ اُداس ہے؟
کس حال میں ہے؟ کچھ تو مرا نامہ بر کھلے

کبھی کبھی تو یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ ۔

بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دکھ تو ہوا
کھلی ہوا میں مگر سانس لینا اچھا لگا

لیکن دوست قریب آجائے تو پھر یہ عالم ہے کہ ۔

کیا چین ملا ہے سر جو اس کے
کندھوں پہ رکھے سسک رہی ہوں

تری خوشبو بچھڑ جانے سے پہلے
میں اپنے آپ میں تجھ کو سمو لوں

دیوار و در نے جس کے لئے ہجر کاٹے تھے
آیا تھا چند روز کو مہمان کی طرح

تجدیدوفا

پروینؔ کے یہاں ہجراور وصال کی کیفیتیں اپنی معنویت کے ساتھ ساتھ نئی جہات بھی رکھتی ہیں۔ایک مستقل ہجر کے بعد پھر وصل کا موسم اپنے ساتھ نئے زخم دے جاتا ہے لیکن اس زخم میں پُرانے زخموں کی کسک نہیں ہوتی۔زخم کچھ نیا سا لگتا ہے ۔

مجھ سے بچھڑا تھا وہ پہلے بھی مگر
اب کہ یہ زخم نیا ہو جیسے

تو گویا ہجر کے پُرانے موسموں کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہو لیکن دوست کا قرب حاصل ہوجانا بھی تو ایک حیرت ہی کا مقام ہے ۔

زمیں کے چہرے پہ بارش کے پہلے پیار کے بعد
خوشی کے ساتھ تھی حیرانگی کی آمیزش

خوشی کے ساتھ حیرانگی کی آمیزش شاید اس وجہ سے ہو کہ دوست کا قرب حاصل ہوجانا غیر یقینی عمل تھا ۔

تری ہنسی میں نئے موسموں کی خوشبو تھی
نوید ہو کہ بدن سے پُرانے خواب اترے

بدن سے پُرانے خواب اُتر جانے کا ہی ردِعمل تھا کہ خودسپردگی کی خواہش نے سر اُٹھایا ۔

خود کو خوشبو کے حوالے کردیں
پھول کی طرز پذیرائی پر

حال جب اتنا خوشگوار ہو اور تمناؤں کے بر آنے کا موسم ہو تو ماضی کی تلخ آمیز باتوں سے گریز کرنا ہی بہتر ہے ۔

تصویر جب نئی ہے نیا کینوس بھی ہے
پھر تشتری میں رنگ پُرانے نہ گھولئے

اس کے بعد پروین کی زندگی میں محبت کا وہ موڑ آتا ہے جہاں تجدید وفا کا رنگ گہرا ہونے لگتا ہے۔ پروین کی جانب سے تجدید وفا کی پہل دوست کے لئے ایک پیغام ہے جو اس سے دور ہے ۔

تجھ کو خواہش تھی کہ گہری رات کا تارا بنے
آکہ اب پہلے سے بھی تاریک ہیں گیسو کے گھر

حالانکہ وہ اس بات کو بھی جانتی ہے کہ اس کی جانب سے تجدید وفا یک طرفہ ہی ثابت ہو گی اس لئے کہ ترک اُلفت کے بعد کسی سے اُمید وفا رکھنا نادانی ہے ۔

ترکِ اُلفت کے بعد اُمیدِ وفا
ریت پر چل سکی ہے ناؤ کبھی

نتیجتاً خود سپردگی نے پھر قسمت کی اس گردش تک پہنچادیا جس سے پروین اپنا دامن بچانا چاہتی تھی ۔

جکڑے جانے کی تمنا تیز تھی
آگئے پھر حلقۂ گرداب میں

اور شاید اس میں قصور اس کی شدّتِ محبت ہی کا تھا جس کے باعث اسے ہمیشہ تکلیف ہی برداشت کرنی پڑی ۔

پازیب سے پیار تھا سو میرے
پیروں میں سدا بھنور ہی ٹھہرے

تجدیدِ وفا کے بعد بھی اجنبیت اور بیگانگیت کی پرچھائیاں برابر قائم رہیں ۔

جیسے کہ کبھی نہ تھا تعارف
یوں ملتے ہوئے جھجک رہی ہوں

اپنی ذات

پروینؔ جب اپنی ذات سے متعلق اظہارِخیال کرتی ہے تو اس کے لہجے میں اس بات کا اعتراف بھی نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے دوست کو برتر مقام دے کر اپنے آپ کو کمتر درجہ دیتی ہے لیکن اپنے وجود کو یکسر فراموش بھی نہیں کرنا چاہتی۔ اپنے وجود کا اثبات اور اپنی انا کا معتبر ہونا وہ زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری سمجھتی ہے جتنا کسی دوسرے کی شناخت کو تسلیم کر لینا۔ یہ تو عشق کی انتہا ہے کہ وہ اپنی انا کو بھول جانے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ وہ جس سے محبت کرتی ہے اس کی شناخت پروینؔ کی ذات میں بھی سرایت کر جائے۔

مجھ کو تسلیم میرے چاند کہ میں
تیرےؔ ہمراہ ہوں گہن کی طرح

اس سے اک بار تو روٹھوں میں اسی کی مانند
اور مری طرح سے وہ مجھ کو منانے آئے

یوں تیری شناخت مجھ میں اُترے
پہچان تک اپنی بھول جاؤں

پروینؔ عشق کو ایک ایسا جذبہ تصور کرتی ہے جو کہیں بھی کسی بھی وقت ختم نہیں ہوسکتا اور یہی عشق کا وہ جذبہ ہے جو اس کی شریانوں میں آگ کا دریا بن کر دوڑ رہا ہے۔

ہے رواں آگ کا دریا مری شریانوں میں
موت کے بعد بھی ہو پائے گا پایاب کہاں

لیکن عشق پربستہ ہوکر کسی گوشۂ قفس میں مقید ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔ لذتِ پرواز اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

تتلی سے مرا پیار کچھ ایسے بھی بڑھا ہے
دونوں میں رہا لذّتِ پرواز کا رشتہ

انسان انفرادی طور پر نہ اپنی شناخت قائم کرسکتا ہے نہ اس کا وجود اعتباری ہوسکتا ہے اسلئے کہ سماجی اکائی بھی دو افراد ہی سے بنتی ہے اور پھر عشق ومحبت کی دنیا کا تو عالم ہی عجب ہے کہ وہاں تنہائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، رشتے اگر بدل جائیں تو بدلتے ہوئے رشتوں کی پہچان بہرحال ضروری ہے چاہے اس میں دوست کی بے وفائی کا ہی دخل کیوں نہ ہو ؎

بچھڑ کے مجھ سے خلق کو عزیز ہو گیا ہے تو
مجھے تو جو کوئی ملا تجھی کو پوچھتا رہا

دوست سے جدائی کا غم ایک ایسی وحشت پیدا کردیتا ہے جو رم آہو سے بڑھ کر ہوتا ہے لیکن پروینؔ اپنی اس وحشت کو اس قدر مہذب بنالیتی ہے کہ اس کی سادگی بھی دوسرے کے لئے پردہ داری کا کام کرتی ہے اس کا یہ سوال ؎

جو حرف سادہ کی صورت ہمیشہ لکھی گئی
وہ لڑکی تیرے لئے کس طرح پہیلی ہوئی؟

تنہائی کے اس صحرا کو اور بھی ابھار کر سامنے لے آتا ہے جو پروین کی ذات میں اُتر آیا ؎

میری وحشت رم آہو سے کہیں بڑھ کر تھی
جب مری ذات میں تنہائی کا صحرا اُترا

پروینؔ جب اپنی ذات سے متعلق بات کرتی ہے تو اسے اس بات کا یقین ہے کہ اگر انسان کو اس کی منزل مقصود حاصل کرنے کے لئے ایک بار بھی موقعہ مل جائے تو وہ پھر زندگی کی تمام سختیوں اور صعوبتوں کو برداشت کر کے اپنی منزل کو پاسکتا ہے، پروینؔ کا یہی شعری تفکر ہے جو اس میں جینے کی امنگ پیدا کرتا ہے اور مسائل حیات کو حل کرنے کے لئے جرأت آمیز حوصلہ بخشتا ہے۔ اسے اپنی حالت کا پتہ ہے جسے وہ علامتوں کا سہارا لے کر اس طرح پیش کرتی ہے ؎

صدف میں اُتروں تو پھر میں گہر بھی بن جاؤں
صدف سے پہلے مگر حلقۂ نہنگ میں ہوں

اسے اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ اپنے غم کا مداوا خود تلاش کر لے گی ورنہ دوست کا تو یہ عالم ہے کہ ؎

ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے
ابھی تو چاک مرے زخم کے سلے بھی نہیں

اک عُمر ہوئی ہے خود سے لڑتے
اندر سے تمام تھک رہی ہوں

بعض وقت تھکن کا یہ احساس پروین کی ذات میں اس لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ جانتی ہے کہ انسان چاہے اپنی آرزوؤں اور خواہشات انفرادی طور پر کتنی ہی پوری کر لے لیکن وہ جس ذات سے وابستہ ہے وہ اگر شریک ہستی نہ ہو تو انسان اپنی فطرت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ؎

کھلونے پالئے ہیں میں نے لیکن
مرے اندر کا بچہ مر رہا ہے

تیسری ذات

پروین کی شاعری میں ''خوشبو'' کے حوالے سے بعض غزلیہ اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پروین اور اس کے دوست کے درمیان رفاقت کے ساتھ ساتھ دونوں میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔ اس خلا کی اور کئی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن پروین نے جن تاثرات کا برملا اظہار کیا ہے ان میں تیسری ذات کے دو ایسے کردار ہیں جن میں ایک تو وہ نسوانی کردار ہے جس کا سرا پروین کے دوست سے ملتا ہے اور دوسرے کا تعلق پروین سے جُڑا ہوا ہے۔ اپنی اپنی سطح پر اس قسم کا ردِعمل کچھ عجیب سا لگتا ہے جیسے ایک کی لغزش سے ناراض ہو کر دوسرا بھی انتقاماً اسی لغزش میں مبتلا ہو گیا ہو۔ نئے تجربات اور بخت آزمائی کا شوق یک طرفہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ دونوں کو ہے۔ پروین کے مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی غمازی کر رہے ہیں ؎

تجھے بھی ذوق نئے تجربات کا ہوگا
ہمیں بھی شوق تھا کچھ بخت آزمائی کا

ہم بھی ترے بعد جی رہے ہیں
اور تو بھی کہیں بہل رہا ہے

پروین کے گھریلوزندگی کے ارتعاشات کی عکاسی اس کی بیشترنظموں اورغزلوں میں ہوتی ہے جن سے ازدواجی رشتوں کے مسائل اور گھریلوالجھنوں کا پتہ چلتاہے۔ہم پہلے بھی اس بات کاذکر کرچکے ہیں کہ پروین فطرتاً مشرقی ذہنیت کی ایک خاتون ہے جونہ صرف اپنے شریکِ حیات کوبے انتہاچاہتی ہے بلکہ اس کی تخلیق کردہ دُنیائے عشق میں وہی اس کاعاشق بھی ہے اورمعشوق بھی۔وہ جب اپنے محبوب سے محبت کرتی ہے تویہ اس کافطری تقاضہ بھی ہے کہ اس کامحبوب بھی اس سے محبت سے پیش آئے ورنہ یک طرفہ عشق محبس بن کرجان لیوابھی بن جاتاہے۔جب پروین ایسے حالات سے دوچارہوتی ہے توجیسے وہ اپنے آپ سے سوال کرنے لگتی ہے ۔

دم گھٹتا ہے گھر میں حبس وہ ہے
خوشبو کے لئے رکوں کہاں تک

اس کاجواب خوداس کی فکرکے اندرہی پوشیدہ ہے کہ وہ عشق کے اس مقام پرآگئی ہے جہاں کبھی کبھی گریزکی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔اس کاتیسری ذات سے یہ کہنا ۔

تو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکتا دیکھوں

اوراپنے شریکِ حیات سے یہ کہنا ۔

تو مری طرح سے یکتا ہے مگر میرے حبیب
جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

ایک احتجاجی اورشکایتی لب ولہجے کی بنیادبھی رکھتاہے۔اس شعرمیں 'کوئی اور' کااشارہ یقیناً اس تیسری ذات کی طرف ہے جہاں پروین گھر کی گھٹن سے گھبراکرکہیں اورزندگی کے آثاراور پناہ ڈھونڈ رہی ہے لیکن اس کاضمیر،اس کاشعوراوراس کی محبت اسے اس بات کااحساس بھی دلاتے ہیں کہ وہ جس کواپناشریکِ حیات،اپنی زندگی سمجھتی ہے وہ یقیناًاس کاوہی محبوب ہے جس کے لمس کے لئے وہ ترس گئی ہے۔تیسری ذات کاوجودتونفسیاتی جواز ہے ۔

گروی ہیں ساعتیں بھی اب تو
کیا تیری صدا کو منہ دکھاؤں

گر لمس نہیں تو لفظ ہی بھیج
میں تجھ سے جدا رہوں کہاں تک

پروینؔ نہ صرف اپنے دوست کو بے انتہا چاہتی ہے بلکہ اس کی خوشیوں کے لئے قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ حالانکہ وہ جانتی ہے کہ اپنی عزیز ترین چیز کسی کے حوالے کر دینا زندگی سے تہی دست ہونا ہے، دل میں رونا اور آنکھوں میں مسکرانا کمال ضبط کی ایک مثال ہے ؎

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن سجاؤں گی

سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی آنکھوں میں مسکراؤں گی

بچھا دیا تھا گلابوں کے ساتھ اپنا وجود
وہ سو کے اُٹھے تو خوابوں کی راکھ اُٹھاؤں گی

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی

ذیل کا شعر تو ایک عجیب ڈرامائی انداز پیدا کر دیتا ہے ؎

پلکوں کو اس کی اپنے دوپٹے سے پونچھ دوں
کل کے سفر میں آج کی گرد سفر نہ جائے

پروینؔ کو اس بات کا غم نہیں کہ اس کا دوست کسی کا ہمسفر بن کر اس سے بے وفائی کر رہا ہے۔وہ جس رشتے میں منسلک ہورہا ہے وہاں محبت کے جذبے سے زیادہ تاجرانہ نقطۂ نظر کام کررہا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے محبت اور تجارت کی جنگ میں تجارت کی فتح ہورہی ہواور محبت کی شکست ۔

سنتے ہیں قیمت تمہاری لگ رہی ہے آج کل
سب سے اچھے دام کس کے ہیں یہ بتلانا ہمیں
تاکہ اس خوش بخت تاجر کو مبارکباد دیں
اوراس کے بعد دل کو بھی ہے سمجھانا ہمیں

پروینؔ کا فن شاعری عورت کی نفسیات کا فن ہے۔روح کی تڑپ درد کی لہر، قربت میں دوری کا اذیت ناک تصور،تنہائی کا کرب اور بہت کچھ پالینے کے بعد بھی سب کچھ کھودینے کا احساس، انہیں سب نے مل کر داستانِ محبت کے پلاٹ کی تشکیل کی ہے جس میں ایک انوکھی چیز یہی عشق کا منفی تصور ہے۔اس کہانی کے ہیرو ہیروئن اپنے دلوں میں بھلے ہی ایک دوسرے کے لئے نرم گوشے رکھیں لیکن بظاہر ایک دوسرے کے لئے نظریاتی اختلاف میں مبتلا نظر آئیں گے۔ دل کی 'ہاں' زبان کی 'نا' بن کر ہی نکلے گی۔ایک دوسرے کے قرب سے جسموں میں بجلی کے کرنٹ نہیں دوڑیں گے،دونوں اپنے اپنے خول میں بندرہیں گے۔یہ دونوں کردار ایک دوسرے کے ساتھ نازک رشتے میں بندھے نظرآتے ہیں اس کے باوجودان میں آپسی خلوص ومحبت ،مہرو وفااورعزت واحترام کے جذبات کی کمی ان کی زندگی کوخوشگوارنہیں بناسکی۔

گھر آنگن

اُردو میں گھرآنگن کی شاعری کا وافرحصہ نہیں ہے۔اُردوشاعرات میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر کی شاعری میں کہیں کہیں نظموں اور بعض غزلوں میں منفرداشعار مل جاتے ہیں۔ اُردو شعرا میں جان نثاراخترؔ نے توباقاعدہ ''گھرآنگن'' کے عنوان سے ایک شعری مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے۔نداؔفاضلی کے یہاں بھی اس موضوع پرکافی موادمل جاتا ہے جوتمام ترشعوری کوششوں کا

نتیجہ ہے۔گھر آنگن کی شاعری کا مرکزی کردار وہی ہوتا ہے جس کا تعلق گھر آنگن سے ہوتا ہے۔ ایک متحرک پیکر کہ جس کا ہر عمل پر کشش اور جس کا حسن گھریلو زندگی کو زندگی بخشتا ہے۔دو محبت کرنے والوں کی ،دوستی،محبت،وفا اور پیار ایک ایسی گھریلو فضا کو تشکیل دیتی ہے جس میں عشق و محبت کی واردات، سکھیوں سے چھیڑ چھاڑ اور ان تمام لوازمات کا تعلق ہوتا ہے جن سے نسوانی کردار اپنی زندگی کی تزئین کاری کرتا ہے۔صبح سے شام تک کے چھوٹے چھوٹے واقعات، دو چاہنے والوں کی آپسی چھیڑ چھاڑ،کچھ ایسا ماحول دکھائی دینے لگتا ہے کہ جیسے ہم اپنی آنکھوں سے گھر کی مہک کو محسوس کر رہے ہوں۔

پروین کے شعری مجموعے ''خوشبو'' کے حوالے سے اس کی غزلوں میں ایسے اشعار بکھرے پڑے ہیں جنہیں ہم گھر آنگن کے تحت شمار کرسکتے ہیں۔گھر کا وہ ماحول جس میں کنوارے پن کی مہک بھی شامل ہے اور ازدواجی زندگی کے رنگ بھی۔عشق کے آزار میں مبتلا ہونا، سکھیوں کو ہمراز بنا کر ان سے اپنے دل کی باتیں بتانا یا ان کی شرارتوں اور چھیڑ چھاڑ کو برداشت کرنا، تنہائی میں محبوب کا گھر آکر اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دینا،زبان سے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی آنگن میں پاؤں کی پازیب کا شور کر کے سب کچھ کہہ دینا یہ وہ تمام کیفیات ہیں جو دبی دبی محبت کا نہ صرف اظہار کرتی ہیں بلکہ سینے میں چھپے ہوئے جذبات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہاں دیکھوں

بند کر کے مری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسے
بوجھے جانے کا میں ہر روز تماشہ دیکھوں

وہ شہر چھوڑ کے جانا تو کب سے چاہتا تھا
یہ نوکری کا بلاوا تو اک بہانہ ہوا
کسے بلاتی ہیں آنگن کی چمپئی شامیں
کہ اب وہ اپنے نئے گھر میں بھی پُرانا ہوا

اجنبی لوگوں میں ہو تم اور کتنی دور ہو
ایک الجھن سی رہا کرتی ہے روزانہ ہمیں

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

مل کے اس شخص سے میں لاکھ خموشی سے چلوں
بول اُٹھتی ہے نظر پاؤں کی چھاگل کی طرح

سمجھا کے ابھی گئی ہیں سکھیاں
اور دل ہے کہ پھر مچل رہا ہے

آنگنوں میں اترا ہے بام و در کا سناٹا
میرے دل پہ چھایا ہے میرے گھر کا سناٹا

رات کی خموشی تو پھر بھی مہرباں نکلی
کتنا جان لیوا ہے دوپہر کا سناٹا

صبح میرے جوڑے کی ہر کلی سلامت تھی
گونجتا تھا خوشبو میں رات بھر کا سناٹا

وہ عجب دنیا کہ سب خنجر بکف پھرتے ہیں اور
کانچ کے پیالوں میں صندل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

پازیب سے پیار تھا سو میرے
پیروں میں سدا بھنور ہی ٹھہرے

شبنم بدست لوگ

اُردو کے تقریباً تمام شاعروں نے دوستی کے معاملہ میں گلوں سے خار بہتر ہیں کا تصور پیش کیا ہے یعنی دوستوں کی شکایت کی اور دشمنوں کو سراہا۔شاید اس کی وجہ یہ ہو اور زندگی کے تجربات بھی یہ بتاتے ہیں کہ اگر دشمن نقصان پہنچانا چاہے تو وہ کھلی دشمنی کا اظہار کرتا ہے اس کا وار سامنے سے یعنی سینے پر ہوتا ہے،اس کے برعکس دوست جب بے وفائی اور دغا پر اُتر آتا ہے تو وہ کھلی دشمنی کی بجائے اپنے دوست کی پشت پر وار کرتا ہے۔بعض اوقات تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مشکل کے وقت جب دوست دھوکا دے جائیں تو دشمن کام آجاتے ہیں۔پروینؔ کی شاعری میں بھی دوستوں کی شکایت کا اظہار شاعرانہ انداز اور تشبیہہ واستعارات کے پردے میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ ہوا ہے۔خوشبو کی غزلیہ شاعری جن لفظیات کا سہارا لے کر پروینؔ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بھنور،موج ساحل،دست شبنمی، شہرِگل،شبنم بدست لوگ،کانٹے،دستِ خوشبو،ناخنِ گل، خوشبوئیں،شاخ درشاخ، پتھر،چشمِ گل، چمکیلے بدن،جیسی شعری لفظیات سے اپنے مافی الضمیر کو شعری پیکر میں سمودیا ہے۔کلام میں شعریت اور تغزل کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

میں بھنور سے تو نکل آئی اور اب سوچتی ہوں
موجِ ساحل نے کیا ہے مجھے غرقاب کہاں

متاعِ قلب وجگر ہیں ہمیں کہیں سے ملیں
مگر وہ زخم جو اس دستِ شبنمی سے ملیں

میں شہرِگل میں زخم کا چہرا کسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو کانٹے چبھو گئے

زخم اب کے تو سامنے سے کھاؤں
دشمن سے نہ دوستی بڑھاؤں

دستِ خوشبو کرے مسیحائی
ناخنِ گل نے زخم چھیلے ہیں

خوشبوئیں مجھ کو قلم کرتی گئیں
شاخ در شاخ مرے ہاتھ کٹے

پتھر پہ کھلی پہ چشم گل میں
کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہوں

اس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفیق بھی دشمن سے مل چکا

سیاسی وسماجی مسائل

پروین کے مجموعہ ہائے کلام میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت خوشبو کو ملی جس میں حسن اور روشنی کی جمالیات قدم قدم پر قاری کا دامن تھام لیتی ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین کی شاعری میں واردات عشق اور معاملات حسن وعشق کی داستانیں شعری پیکر میں دادو تحسین وصول کر چکی ہیں لیکن اس مجموعے میں اس کا سماجی شعور بہت بیدار نظر نہیں آتا ہے۔اپنے اطراف اور اردگرد کے ماحول پر جب اس کی نظر جاتی ہے تو سماجی اور سیاسی سطح پر کچھ مسائل اسے اپنی طرف ضرور متوجہ کر لیتے ہیں لیکن ان کو پیش کرنے میں پروین نے اپنے شاعرانہ اسلوب اور فنی کمال کا اظہار نہیں کیا۔زیادہ تر باتیں صاف اور شفاف لفظوں میں بیانیہ انداز میں کہہ دی گئی ہیں اور بہت کم ایسے اشعار ہیں کہ جن میں تشبیہات واستعارات اور رمز وکنایہ شعر کا حسن بن سکے ہیں۔ کچھ اشعار تو ایسے بھی ہیں جو ترقی پسندوں کے زیر اثر دہقانوں کو موضوع شعر بنا کر کہے گئے ہیں جن

میں کہیں پروینؔ کی انفرادیت نظر نہیں آتی۔عورتوں کے مسائل پر پروینؔ نے اپنی نظموں میں بارہا روشنی ڈالی ہے لیکن خوشبو کی غزلیہ شاعری میں یہ موضوع کہیں کہیں سامنے آتا ہے۔پروینؔ نے اپنے دوسرے شعری مجموعوں میں یقیناً اپنے ملک کے سیاسی حالات کا گہرا مشاہدہ کرتے ہوئے ان پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے جس کا ذکر ان کے موقع ومحل پر آئے گا۔یہاں خوشبو سے اخذ کردہ کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں ۔

سماجی مسائل ۔

اپنے گھر کی طرح وہ لڑکی بھی
نذرِ سیلاب ہو گئی شاید

پر سمیٹے ہوئے شاخوں میں پرندے آئے
ایسے سوئے کہ ہوا سے بھی جگائے نہ گئے

سوچ کا رشتہ سانس سے ٹوٹا جاتا ہے
لو سے زیادہ جبر فضا کے حبس میں ہے

ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے
جس کی نیند کا سرچشمہ تک چرس میں ہے

زمیں کے حلقے سے نکلا تو چاند پچھتایا
کشش بچھانے لگا ہے ہر اگلا سیارہ

پورے انسانوں میں گھس آئے ہیں
سر کٹے، جسم کٹے، ذات کٹے

احرام ہے یا کہ شہر میرا
انسان ہیں یا حنوط لاشیں

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
جرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

سیاسی مسائل ۔

وہ کہ جن کے ہاتھ میں تقدیرِ فصل گل رہی
دے گئے سوکھے ہوئے پتوں کا نذرانہ ہمیں

مری گلی میں کوئی شہر یار آتا ہے
ملا ہے حکم کہ لہجے کو محترم کرلوں

کچھ تو شہر درد کا احوال آنکھوں نے کہا
اور کچھ گلیوں کی سفاکی تھکن پر سج گئی

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد قتل گاہ میں ہے

بچوں کے خواب پی کے بھی حلقوم خشک تھے
دریا کی تشنگی میں بڑی وحشتیں رہیں

راتیں تو قافلوں کی معیت میں کاٹ لیں
جب روشنی بٹی تو کئی راہبر کھلے

ہمارے عہد میں شاعر کے نرخ کیوں نہ بڑھیں
امیرِ شہر کو لاحق ہوئی سخن فہمی

واں شہر ڈوبتے ہیں اِدھر بحث کہ انہیں
خم لے گیا ہے یا خمِ محراب لے گیا

☆☆☆

مجموعہ صد برگ

''صد برگ'' کے شعری مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ''صد برگ'' کی غزلوں میں پروینؔ کا تخلیقی شعور زندگی کے تجربات ومشاہدات کے باعث ایک باشعور فنکار کا پختہ شعور ہو کر دنیائے ادب کو زندگی کی نئی جہات سے روشناس کروا رہا ہے۔

پروینؔ کے یہاں تخلیقی عمل کو اہمیت ہے تخلیق کو وجود میں لانے والے محرکات پر نظر ہے۔ وہ تخلیق کے لئے آمادہ کرنے والے ارتعاشات اور حرارت کو محسوس کرتی ہے اس لئے اس کی غزلیہ شاعری میں لسانیات کا وہ عمل دخل نہیں جو شعر کو تجربہ گاہ میں لا بٹھا دیتے ہیں۔ ''صد برگ'' میں پیش لفظ کے طور پر پروینؔ نے اس مجموعے سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''سچائی جب مخبروں میں گھر جائے تو گفتگو علامتوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔'' نئی معنویت اور نئی لفظیات سے پیدا ہونے والی فضا ''صد برگ'' کے حوالے سے پروینؔ کی غزلوں میں یقیناً دیکھی جا سکتی ہے لیکن پروینؔ کی یہ شعری خصوصیت ہے کہ اس نے جن لفظیات وعلامات کا استعمال کیا ہے ان کا ہماری تہذیب کے پس منظر سے ایک گہرا ربط وتعلق ہے اور ظاہر ہے بقول شارب رودولوی:

> ''علامت کے لئے ایک تہذیبی پس منظر ضروری ہے۔ اگر کہیں گلاب کا پودا ہی نہیں ہوگا اور کوئی گلاب سے واقف ہی نہیں ہے تو ان کے لئے گلاب ، رنگ، خوشبو، حسن اور نزاکت کی علامت کیوں کر بن سکتا ہے۔''[1]

پروینؔ کی شعری انفرادیت کے خط وخال میں اس کی علامات بطور خاص رنگ، خوشبو، روشنی اور ہوا نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ چونکہ یہ علامتیں بالکل ذاتی اور شخصی بھی نہیں ہیں اس لئے ذہن فوری طور پر ان کی معنویت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ سیاسی وسماجی تبدیلیوں کے پس منظر میں بھی پروین نے ایسی علامات کا استعمال کیا ہے جن میں نئی معنویت کے ساتھ اس کی تہہ داری کا بھی لطف لیا جا سکتا ہے۔

---

[1] تنقیدی مباحث صفحہ ۸۸

محبوب کا تصور

پروینؔ کے یہاں (صد برگ کے تناظر میں) جو شعری کردار ایک عاشق کے روپ میں ابھرتا ہے، تضادات کا مجموعہ ہے، وہ کبھی محبوب کا ہم مزاج ہو کر اپنے رشتہ، محبت کو استوار رکھتا ہے تو کبھی مختلف المزاجی کے باعث عاشق اور محبوب کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں جن میں شاعرہ کے محبوب کا ہرجائی پن، اس کے ترک رفاقت کے پریشان کن اقدام کا عمل اور ترک تعلق کے لئے راستوں کا کھلا رکھنا، کچھ شاعرہ کی تلخ نوائی، تلون مزاجی، جس کے نتیجے میں باہمی اجتناب اور رشتوں کے فاصلے اس مقام پر لے آتے ہیں کہ جہاں پہچان کی بازیافت تک ممکن نہیں رہتی اور ان سب باتوں کی وجہ رشتوں کا یک رخا پن بھی ہے کہ جس کی وجہ سے رشتہ محض ایک عادت بن کر رہ جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ بھی پھر سے کسی کے انتظار میں دریچے وار کھنے کا عمل اور تجدیدِ وفا کی خواہش ایک دوسرے کے لئے کشش کا باعث اور متضاد کیفیتوں کی کشمکش ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ بیک وقت مختلف کیفیات کی عکاسی اور عمل ورد عمل کے بے معنی نتائج زندگی کو بھی بے معنویت کے مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

موجۂ خواب ہے وہ اس کے ٹھکانے معلوم
اب گیا ہے تو یہ سمجھو کہ پلٹنا مشکل

اس ترک رفاقت پہ پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی

نئے سفر پہ چلتے ہوئے یہ دھیان رہے
رستے میں دیوار سے پہلے در بھی ہے

اک حرف تلخ میری زباں سے نکل چکا
کیا عذر ہو کہ تیر کماں سے نکل چکا

کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

ملنے کا تو مسئلہ نہیں ہے
پہچان بھی پائے بات تب ہے

اس خواب کی لو کو مت بجھانا
یہ میرا چراغ نیم شب ہے

دریچے میں نے بھی وا کر لئے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

جہاں حرف تعلق ہو اضافی
محبت میں وہ باب آنے کو ہے پھر

وہ تردید وفا تو کررہا تھا
مگر اس شخص کی حالت عجب تھی

حرف تعلق کے باب میں دوست کی مدح اور تعریف باہمی رشتوں میں استواری ایک دوسرے کے لئے وفا پرستی اور ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی گزارنے کا جذبہ نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور وفا پرستی بھی ایسی جہاں کسی تیسرے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن جب حالات منقلب ہوتے ہیں تو پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ جیسے نہ صرف دونوں شخصیتیں مختلف المزاج ہیں بلکہ باہمی اجتناب کے اسباب بھی پیدا ہونے لگتے ہیں اور پھر اس کے بعد ترکِ تعلق کے امکانات بھی۔
کہاں تو یہ انداز کہ اپنے رشتوں کو ہاتھ اور دعا کا رابطہ کہنا، اپنے دوست کے علاوہ اور کسی خوش نظر رنگ پر نظریں نہ ڈالنا اور زنجیر محبت کو اس لئے قبول کر لینا کہ وہ دوست کے نام کی ہے لیکن پھر

اس کے بعد ہاتھ چھڑانے کے لئے موقع کی تلاش اور زنجیر پا سے رہائی کی خواہش غرض کہ پروین کی غزلیہ شاعری میں بیک وقت رشتوں کے کئی جہات اور پرتو سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسن اور عشق کے معاملات میں تسلسل کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں محبت میں رشتوں کا سفر ارتقائی یا سراطِ مستقیم پر نہیں ہے بلکہ پیچ در پیچ ہے اور دورانِ سفر کئی موڑ آتے رہتے ہیں ۔

اس کی ثنا میں حدِ بیاں سے نکل چکا
دل کا یہ حال ہے تو یہاں سے نکل چکا

قید میں گزرے گی جو عمر بڑے کام کی تھی
پر میں کیا کرتی کہ زنجیر ترے نام کی تھی

گواہی کیسے ٹوٹتی معاملہ خدا کا تھا
مرا اور اس کا رابطہ تو ہاتھ اور دعا کا تھا

سحاب میں تھی تو وہ بھی صبا مثال ہی تھا
کسی کے واسطے رکنا ذرا محال ہی تھا

جب تک وہ بے نشان رہا دست رس میں تھا
خوش نام ہو گیا تو ہمارا نہیں رہا

وہ تو کہیے کہ کھلی آنکھ رکھی نیند میں بھی
ورنہ ہم شب کا کوئی وار تو چل جانا تھا

پروین کی تخلیق کردہ شعری فضا میں عشق کا ایک ایسا ماحول ہے جہاں دوستی بھی ہے وفاشعاری بھی، رشتے بھی ہیں اور رشتوں کا ٹوٹنا بھی، ترکِ تعلق کے ساتھ تردیدِ وفا ہے۔ تو بچھڑ جانے کے بعد ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس بھی۔ کبھی دونوں کی یاد ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہے تو کبھی

پیڑوں پر کھدے ہوئے نام کا قائم رہنا رشتوں کے استوار ہونے کی علامت بن جاتا ہے۔پروین کی غزلوں میں جو عاشق ومعشوق کے دو کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں ان دونوں میں ان کے کردار سے متعلق استواری نظر نہیں آتی۔

تجدیدِ وفا

پروینؔ کی غزلوں میں تجدیدِ محبت کا رجحان بھی بار بار سامنے آتا ہے۔ترکِ تعلق کے باوجود رشتوں کی از سرِ نو بازیافت اپنے دامن میں درد و کسک کی کیفیت لئے ہوئے ماضی کی طرف مراجعت کرتی ہے اور فطرت کے جمالیاتی عناصر میں دوست کی شباہت جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جسے شاعرہ تشبیہات واستعارات کے پردے میں شعری پیکر عطا کر کے تخلیقی سطح پر انسانی جذبات واحساسات کی مصور بن جاتی ہے۔

قرار داد محبت تو کب کی فسخ ہوئی
فریق آج یہ کیسی قسم اُٹھاتے ہیں

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھروندہ کر گیا تعمیر کون

پروینؔ نے قراردادِ محبت کے اظہار کے ساتھ رفاقت کے بنتے ٹوٹتے دائروں کی عکاسی تخلیقی سطح پر جس طرح کی ہے اس میں اس کا اندازِ بیان اور شعری اسلوب بھی منفرد نظر آتا ہے۔اس اسلوب میں لفظیات بھی ہیں علامات بھی،تشبیہات بھی ہیں اور استعارات بھی،شخصیت کا انعکاس بھی ہے اور اس سے گریز بھی،طنزیہ لب ولہجہ بھی ہے اور درد بھری آواز بھی،ایک سیمابی کیفیت بھی ہے اور اضطراب بھی۔ایک ایسے شعری ماحول کی تشکیل کہ جس میں پہنچ کر قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انسانی جذبات واحساسات کو پیکر میں مقید دیکھ رہا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین کی ازدواجی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز ہیں جن میں جینے کی امنگ بھی ہے اور محبوب کے ہرجائی پن کا گلہ بھی،رفاقت کے لئے ہاتھ بڑھانے کا عمل بھی ہے تو دوست سے دامن بچانے کا اقدام بھی،کسی کے نام کی پاسداری اور اس سے وفا پرستی کا اظہار بھی ہے اور اس کی بے اعتنائی پر تلخ کلامی بھی لیکن مجموعی طور پر اس کی شاعری سے یہ بات نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے کہ وہ

ایک وفاپرست کردار ہے جو اپنے دوست سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور کسی دوسرے کی شرکت اس کے جذبۂ رقابت میں تیزی اور تندی پیدا کردیتی ہے۔اسے اپنے دوست سے شکایت ہے تو اس لئے کہ وہ کوئی پرایا نہیں اس کا اپنا ہے۔اسے اپنے دوست سے محبت ہے تو اس لئے کہ وہ اس کا شریک حیات بھی ہے۔وہ وفاپرستی کا دعویٰ کرتی ہے تو اس لئے کہ وہ ایک مشرقی خاتون بھی ہے،اس کے یہاں اگر جھنجھلاہٹ اور ناراضگی کا اظہار ہے تو اس لئے ہے کہ جس قدر وہ ٹوٹ کر اپنے دوست کو چاہتی ہے اس کے جواب میں وہ بھی اسی درجے کی چاہت کی متمنی ہے۔یہ تو اس کا شاعرانہ مزاج ہے جو اسے کبھی کبھی تثلیث کا خالق بھی بنادیتا ہے۔تثلیث سے مراد دو شخصیتوں کے ساتھ کسی تیسرے کا وجود جس کے باعث آپسی رشتوں میں دراڑ بھی پیدا ہوجاتی ہے یا پھر باہمی رشتوں میں ازسرِ نو استواری و مضبوطی بھی۔

پروینؔ ایک ذہین عورت ہے اس لئے اس کے موضوعات عشق میں ذہانت کا بھی عمل دخل ہے۔اس کے یہاں محبت کا عامیانہ تصور نہیں اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ زندگی کی اپنی اقدار ہیں اور انسانی زندگی بھی اپنے محور سے الگ گردش نہیں کرسکتی اس لئے کہ کوئی چیز چاہے وہ بے جان ہی کیوں نہ ہو قوانین قدرت اور فطرت سے گریز کرکے قائم نہیں رہ سکتی۔پروین کا عشق شاعرانہ اور روایتی عشق نہیں ہے بلکہ یہ عشق اپنے میں کنوارے پن کا رنگ بھی نہیں رکھتا،در حقیقت اس عشق میں ان دو زندگیوں کی کہانی بھی مضمر ہے کہ جن کی تخلیقات سے یہ کائنات بھی برقرار ہے اور جو منشاء الٰہی کو بھی پورا کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

شہرِ بے چراغ

پروینؔ کا شہر سے متعلق یہ تصور اُبھرتا ہے کہ دراصل شہر پہ قبضہ شہریاروں اور امیر شہر کا ہوتا ہے۔یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے جاہ وجلال اور عظمت منوانے کے لئے کسی بھی طرز ستم سے باز نہیں آتے۔پروینؔ نے ایسی شخصیات پر گہرا طنز کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان شہریاروں کے مقابلے میں نادار لوگ ان سے بڑے ہوتے ہیں اور یہ سچ بات کہتے ہوئے اسے کوئی خوف بھی نہیں آتا کہ حقیقت کو چھپایا نہیں جاسکتا ۔

امیرِ شہر سے سائل بڑا ہے
بہت نادار لیکن دل بڑا ہے

خوش آئے تجھے شہرِ منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

فصیلِ شہر پر تھی ضرب کاری
کماں داروں کا شوقِ شہر یاری

شہر کی چابیاں اعدا کے حوالے کر کے
تحفتاً پھر انہیں مقتول سپاہی دیں گے

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آگئی ہوتی ہوئی سر سے

دستار کے بل گن کے جہاں ملتی ہو عزت
اس شہر میں توقیرِ سخن کار عجب تھی

بہاؤ تیز تھا طوفان ابر و باد بھی تھا
فصیلِ شہر سے دریا کو کچھ عناد بھی تھا

ہزار بار ہوئی بند جس پہ شہر پناہ
سنا گیا ہے کہ وہ شخص شہر زاد بھی تھا

ان شعروں میں شہریاری سے متعلق اور دیگر تلازمات کا بھی خوش اسلوبی سے استعمال کیا گیا ہے کہ

جن سے ایک تاریخی پس منظر نظروں کے سامنے ابھر کر آتا ہے۔مندرجہ بالا شعروں میں جن تلازمات کو تخلیقِ شعر کی بنیاد بنایا گیا ہے ان میں شہزاد، شہر پناہ، شہریاری، امیرِ شہر، شوقِ شہریاری، فصیلِ شہر جیسے الفاظ ایک درباری اور تاریخی ماحول کی منظر کشی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان حالات میں شہر کا جو تصور سامنے آتا ہے وہ کچھ اس قسم کا ہے۔

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

جدھر دیکھو کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

کسی بستی میں ہوگی سچ کی حرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

کس شہر میں لائی خوش کلامی
دل پیڑبی و رفیق شامی

آسیب کون سا ہے تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں نقلِ مکانی بھی ساتھ ہے

نکلے اگر تو چاند دریچے میں رُک بھی جائے
اس شہرِ بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

شہر میں سانپ جب انسانوں سے زائد ہو جائیں
پیشِ آئینہ کوئی ذہن میں ڈر کیا لانا

بہت سی ایسی باتیں کہ جنہیں وہ ٹوک الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا پروین نے انہیں استعاروں اور علامتوں کے پردے میں پیش کر دیا ہے جیسے برف، چاند، دھوپ، بارش، بہار کا سورج وغیرہ ۔

شہر کی ہر رہ گزر پر برف خیمہ زن ہوئی
بند اگلے چاند تک اب دھوپ کا رستہ ہوا

بس اے بہار کے سورج بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تری دھوپ میرے شہر کا رنگ

یہ احتجاج بجا ہے کہ تیز تھی بارش
یہ مانتا ہے کہ کچا تھا اپنے شہر کا رنگ

شہر کے موضوع پر کچھ اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں محبوب کو مخاطب کیا گیا ہے یا محبوب کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے ۔

تمہارے شہر کی ہر چھاؤں مہرباں تھی مگر
جہاں پہ دھوپ کڑی تھی وہاں شجر ہی نہ تھا

اس سے ملتے ہوئے چہرے بھی بہت ہونے لگے
شہر کے شہر سے اک ساتھ نمٹنا مشکل

آج تک شہر کا چہرا نہیں دھلنے پایا
گرد کا کیسا بگولہ تیرے جانے سے اُٹھا

شہرِ منافق کی امیری

پروین محض عشق و محبت ہی کی شاعرہ نہیں جہاں اس نے اپنی ذاتی اور ازدواجی زندگی کے حالات و معاملات کو تخلیق شعر کے لئے موضوع بنایا ہے وہیں آس پاس کے حالات اور ملک و سیاسی واقعات سے بھی بے خبر نہیں رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے شعری مجموعے

"خوشبو" میں سماجی اور سیاسی حالات سے اتنی وابستگی نظر نہیں آتی جتنی کے "صد برگ" میں ہے۔ اس نے جہاں روایتی موضوع یعنی سیاست کو تخلیق شعر کی اساس بنایا ہے وہیں اس کی یہ بھی خوبی ہے کہ استعارات وتشبیہات کی جاذبیت اور جدت کے باعث اس کا شعری اسلوب ایک انفرادیت کے ساتھ پروین کی شناخت بن گیا ہے۔ بہت سے ایسے موضوعات ہیں جنہیں دو ٹوک بیان کرنا مناسب نہیں وہاں پروین نے شعری علامات ولفظیات سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ کچھ علامات واستعارات تو اس کے اسلوب سے مخصوص ہو گئے ہیں جن میں ہوا، گلاب، پت جھڑ، دھوپ، شجر، سرخ وسبز رنگ، چڑیا، خوشبو، پھول، پرندہ جیسی علامتیں شاعرہ کے مافی الضمیر کو غزل کی تمام رعنائیوں اور تغزل کے ساتھ پیکرِ شعر میں ڈھال دیتے ہیں۔ علامت سے متعلق جہاں یہ کہا گیا ہے:

" Figures and symbols are images used in a particular way to explore the lessknown through the know."(1)

پروین نے سیاسی موضوعات میں سیاسی رہنماؤں کی گندی سیاست کو بے نقاب کرنے میں اپنے فن کا ہنرمندانہ استعمال کیا ہے۔ اس کے شعری افکار میں یہ بات بار بار سامنے آتی ہے کہ ہمارے عہد کے سیاسی رہنما اپنے قول وفعل میں تضاد کے حامل ہوتے ہیں عوام کے ساتھ ان کا فریب، وعدہ خلافی، جھوٹی تسلیاں اور ان کی سنہری خوابوں کی تجارت جس کے پس پردہ اپنی بساطِ سیاست پہ شاطرانہ چالیں غرض کہ کوئی ایسی قابلِ تعریف بات نہیں جو ان کی مدح میں پیش کی جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ پروین نے جہاں کہیں ان کو موضوع سخن بنایا ہے اس کے لہجے میں طنز اور تلخی در آئی ہے ؂

جھونکے کچھ ایسے تھکتے ہیں گلوں کے رخسار | جیسے اس بار تو پت جھڑ سے بچا ہی دیں گے

بس اے بہار کے سورج بڑھا یہ قہر کا رنگ | جلا گئی ہے تری دھوپ میرے شہر کا رنگ

شجر کو سبز قبا دیکھ کر یہ الجھن ہے | کہاں پہ رنگِ نمو ہے کہاں پہ زہر کا رنگ

1.Interpreting literature (Seventh Edition p 377)

کچھ اتنی تیز ہے سرخی کہ دل دھڑکتا ہے　　　　کچھ اور رنگ پسِ رنگ ہے گلابوں میں

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن　　　　کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

خود ڈھونڈ رہا ہے آبِ حیواں　　　　اور پیچھے قبیلہ جاں بلب ہے

بکھر گیا ہے پھول تو ہمیں سے پوچھ کچھ ہوئی　　　　حساب باغباں سے ہے! کیا دھرا ہوا کا تھا

جہاں پروین نے سیاسی رہنماؤں پر طنز کیا ہے وہیں اسے اس بات کا بھی دکھ ہوتا ہے کہ خود اہل وطن نے بھی وطن کو اس مقام پر نہیں پہنچایا جہاں آج اسے ہونا چاہئے تھا۔ ایک ہی قوم ہونے کے باوجود نسلی، علاقائی تعصّبات کی آگ نے خود بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیا۔ یہ بات نہیں کہ اہلِ سیاست ہی اپنے مکروفریب کے جال بچھاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی عوام خود بھی فریب میں آ کر غیر شعوری طور پر ایسے کارنامے انجام دے دیتے ہیں جو کسی بھی صورت میں ملک وقوم اور انسانیت کی فلاح و بہبودی کے لئے مفید نہیں ہوتے۔ آپسی سازشوں کے باعث آندھی آجاتی ہے جوان رُتوں کو بھی بے تاج کر کے رکھ دیتی ہے جن کے نصیب میں ہما جیسا پرندہ ہوتا ہے ۔

ابھی تک بھائیوں میں دشمنی تھی
یہ ماں کے خوں کا پیاسا ہو گیا کون

اس بار جو ایندھن کیلئے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

بہت سے ناموں کو اپنے سینے میں چھپائے
جلی ہوئی بستی میں ایک شجر بھی ہے

جس کو اک نسل نے سینچا تھا لہو سے اپنے
اک نہ اک روز تو اس پیڑ کو پھل جانا تھا

مقتل سے آنے والی ہوا کو بھی کب ملا
ایسا کوئی دریچہ کہ جو بے صلیب تھا

آندھی نے ان رُتوں کو بھی بے تاج کر دیا
جن کا کبھی ہما سا پرندہ نصیب تھا

دھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اُگاتا کیسے
شاخ پھوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آرے نکلے

پروین کی غزلیہ شاعری میں بھی ملک کی بے امنی، فسادات اور ان شخصیتوں کی طرف بھی اشارے وکنایے ملتے ہیں جو اہلِ قوت سیاسی رہنماؤں کی شہ پر ملک میں ابتری پھیلانے کا سنگین جرم کر بیٹھتے ہیں ۔

خوشبو کا حساب ہو چکا ہے
اور پھول ابھی کھلا نہیں ہے

ذرا سی کرگسوں کو آب و دانے کی جو شہ ملی
عقاب سے خطاب کی ادا ہی اور ہو گئی

جنگ کا ہتھیار طے کچھ اور تھا
تیر سینے میں اُتارا اور ہے

دراصل قوموں کی زندگی میں ایسے دور آتے رہتے ہیں جب وہ مستقبل کے خواب دیکھ کر ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کرتے ہیں یا پھر ان پر ایسی غفلت طاری ہوتی ہے کہ ان کے سامنے نہ

کوئی منزل ہوتی ہے نہ کوئی راستہ اور پھر یوں ہوتا ہے کہ قوم کا ایک مزاج بن جاتا ہے اور وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے بجائے مسائل کے دم گھٹا دینے والے حبس ہی پر قناعت کر لیتی ہے لیکن اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ اپنے رہنماؤں سے ان مسائل کا حل پوچھے جو خود ملک و قوم کے دشمن ہوتے ہیں۔

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کی دے تعبیر کون

ہمیں بجھانے کو اندر کا حبس کافی ہے
ہوا مزاجوں کا احسان کم اُٹھاتے ہیں

لیکن قدرت کا یہ بھی قانون ہے کہ وہ ظلم کو برداشت نہیں کرتی اور سیاسی دنیا میں ایسے انقلاب آتے ہیں جب ہر شخص کو اپنے عمل کا حساب دینا ہوتا ہے اس لئے بھی کہ وقت کا انصاف ہو کر رہتا ہے اور اس کی عدالت میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں ہوتا۔

ہزار بار ہوئی بند جس پہ شہر پناہ
سنا گیا ہے وہی شخص شہر زاد بھی تھا

ہوا نژاد اور آج ہے گوشہ گیر ایسا
رگ گلو میں ہوا ہے پیوست تیر ایسا

پروین ایک سچے فنکار کی طرح اپنے دل میں حب الوطنی کے جذبے کو بیدار رکھتی ہے اپنے ملک میں امن وآشتی کا ماحول اور اس دور مسابقت میں وطن کو مائل بہ ارتقاء دیکھنا اس کی فطری خواہش ہے اور یہ سب اس وقت ممکن ہے جب کہ اہلِ سیاست جن کے ہاتھوں میں زمام کار ہوتی ہے وہ مخلص ہوں، ایماندار اور غیر متعصب ہوں اپنی ذات اور خاندان سے زیادہ اپنے ملک اور قوم کی فلاح و بہبودی کو ترجیح دیتے ہوں۔ لیکن آج کے اس دور میں عالمی پیمانے پر بھی یہ دیکھا جا رہا ہے کہ خودغرضی کے اندھے سیاسی رہنماؤں نے روشنی اور سورج کو قتل کرنے کی سازشوں میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اپنے اقتدار اور عامرانہ ذہنیت کے باعث انہیں انسانیت سے کوئی محبت ہے

اور نہ اس خدائے کائنات میں اصلاحی اقدام کے لئے کوئی جذبہ۔تمام کرۂ ارض فسادات کی زد میں ہے کہ جہاں تعمیر کی بجائے تخریب کا جذبہ پرورش پا رہا ہے۔

پروین کے غزلیہ اشعار میں سورج اور ہوا ایسے استعارے ہیں جو ملک کے رہنماؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اور رہنما بھی ایسے جو اقتدار کی ہوس اور حکومت کے نشے میں بے زبانوں کی زبان کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یہاں تک کہ ملک میں سیاسی و سماجی ماحول کو ابتر کرنے والوں کی پشت پناہی بھی کرتے ہیں ؎

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

سمیٹ لیتی شکستہ گلاب کی خوشبو
ہوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہنر ہی نہ تھا

بچ رہا تھا اک پرندہ ڈال پر ہنستا ہوا
جال وہ پھینکے ہوا نے وہ بھی پر بستا ہوا

اُردو کی یہ شعری روایت رہی ہے کہ جب زبان و قلم پر پہرے بٹھا دئے جاتے ہیں فنکار علامات واستعارات کے پردے میں بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنے سے نہیں چوکتا۔پروین نے اپنے ایک شعر میں خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

الزام تھا دیے پہ نہ تقصیر رات کی
ہم نے تو بس ہوا کے تعلق سے بات کی

(خود کلامی)

پروین کے بعض اشعار جو اشارے و کنایے کو اپنے دامن میں رکھتے ہیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ بہترین شعروں کی تخلیق ایسے ہی ماحول میں ہوتی ہے جس کی تشکیل سیاسی جبر سے ہوتی ہے۔جب انسانوں کی آزادی چھین کر انہیں سخت قوانین کے حصار میں مقید کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ نام نہاد کھلی فضا کے مقابلے میں ایک حساس فنکار قیدِ قفس کو ترجیح دینے لگتا ہے ؎

براہِ روزنِ زنداں ہوا تو آتی تھی
کھلی فضا میں گھٹن وہ ہے جو قفس میں نہیں

یہ گھٹن قوم کے ان خودغرض رہنماؤں کی بدولت ہے جنہیں قوتِ اقتدار کی ہوس نے اندھا کر دیا ہو اور جنہیں اپنی ذات کے علاوہ اور کسی کا دھیان نہیں رہتا ۔

سر شاریٔ رہبری میں دیکھا
پیچھے مرا قافلہ نہیں ہے

ملک کے پُر آشوب ماحول کی منظرکشی رات، برف اور چاند کی علامات کے پردے میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے ۔

برہنہ شاخوں کا جنگل گڑا تھا آنکھوں میں
وہ رات تھی کہ کہیں چاند کا گزر ہی نہ تھا

شہر کی ہر رہگزر پر برف خیمہ زن ہوئی
بند اگلے چاند تک اب دھوپ کا رستہ ہوا

چاند کا پیغام دھندلا تھا نہ چہرا حرف کا
شہر کے سارے دریچوں پر ہے پردہ برف کا

گھروں پر جبر یہ ہوگی سفیدی
کوئی عزت مآب آنے کو ہے پھر

''عزت مآب'' کا طنزیہ لب ولہجہ بھی شاعرہ کے ذہنی پس منظر کو شعری پیکر میں نمایاں کر رہا ہے۔

جہاں انصاف کا قتل ہو رہا ہو اور سچ کہنے والوں کو تہہ تیغ کیا جا رہا ہو، جھوٹے الزامات عائد کر کے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا رہا ہو وہاں پر سچائی اور انصاف کا نام لینا بھی کسی مصیبت سے کم نہیں ۔

سچ جہاں پابستہ ملزم کے کٹہرے میں ملے
اس عدالت میں سنے گا عدل کی تفسیر کون

سلبِ بینائی کے احکام ملے ہیں جو کبھی
روشنی چھونے کی خواہش کوئی شب زاد کرے

وہ بھی سرِ مقتل ہے کہ سچ جس کا تھا شاہد
اور واقفِ احوال عدالت بھی بہت تھی

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آ گئی ہوتی ہوئی سر سے

لہو جمنے سے پہلے خون بہادے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

ایسے ماحول میں کہ جب موت بھی نئی طرز کی ایجاد کی جارہی ہواور سر کے ساتھ دستار بھی سنبھالنا مشکل ہو،کوئی اس بات کی جرأت بھی نہیں کرسکتا کہ رونما ہونے والے واقعات کی چشم دید گواہی دے سکے ۔

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

سرِ مقتل کسی کے پیرہن میں
گلابی رنگ کی حدت عجب تھی

لیکن یہی وہ ''گلابی رنگ کی حدت'' ہوتی ہے جوایک دن قاضی شہر کے خلاف خود گواہی بن جاتی ہے اوروقت اپنے روز وشب سے ایسے لمحے کو بھی جنم دیتا ہے جو بغاوت کی لہر بن کر حکمرانِ وقت

کوزوال کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے ۔

جب لہو بول پڑے اس کے گواہوں کے خلاف
قاضی شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

سورج نے کبھی تو سوچا ہوتا
کیا میرے زوال کا سبب ہے

غرض کہ پروینؔ کی شاعری میں ملک وقوم کے حالات اورزیردستوں کازبردستوں کے ہاتھوں استحصال ہونانیزحکمرانِ وقت کے زوال کے اسباب پرلفظیات واستعارات کے پردے میں روشنی ڈالنے کاعمل اس خوبی سے ظہورپذیرہواہے کہ جہاں لفظوں کی وہ تہہ داریاں نہیں کہ قاری ان میں ہی الجھ کرشعری معنویت کونظرانداز کرجائے۔

☆☆☆

مجموعہ خودکلامی

''خودکلامی'' کے حوالے سے پروینؔ شاکر کی شعری تخلیقات بالخصوص غزلیات کی روشنی میں جوتاثر قاری کے دل ودماغ پر اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ پروینؔ نے جن مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ اس کے خارجی مسائل نہیں تھے۔وہ اپنے اندر جوزندگی جی رہی تھی اسی کی آئینہ داری کی ہے۔تصادم اور کشمکش خارج کی بنسبت باطن میں زیادہ شدید رہا۔جب احساسات سارے رگ وپے میں دوڑنے لگتے ہیں،تمام حواس پر کوئی ایک احساس اس طرح چھاجاتا ہے کہ باہر سے فنکار کے ذہن کا تعلق منقطع ہوجاتا ہے،پروینؔ کے لئے اسی احساس کا اظہار ضروری تھا،اپنی روح کی تنہائی اوراپنے دکھوں کی فصل سمیٹنے کی کوشش میں وہ اس طرح بکھر گئی کہ بعض اوقات اس کارشتہ زندگی سے ٹوٹتا ہوانظر آتا ہے لیکن جب وہ عشق اورمحبت کی دنیاسے باہر قدم نکالتی ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ زندگی،فطرت،چاندنی،چانداور حسین خوابوں کے علاوہ بھی اور کچھ ہے۔انسان ان طلسمی فضاسے بہت آگے نکل گیا ہے۔پروینؔ نے رومانیت سے رشتہ مضبوطی کے ساتھ استوار رکھنے کے باوجودزندگی سے اس کارشتہ ٹوٹنے نہیں دیا۔وہ خلاؤں میں جینے والی فنکارہ نہیں ہے۔''خودکلامی'' کا مطالعہ اس بات کوتو ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کے اورمسائل سے پروینؔ کی وابستگی ڈیڈیکیشن کی حدتک نہیں تھی۔اشتراکیت نے اسے کسی حدتک متاثر ضرور کیا تھالیکن اس کاوہ کچھ زیادہ اثر نہیں لے پائی۔اس کی سب سے بڑی درس گاہ یا تجربہ گاہ اس کا اپنا گھر اوراردگرد کا ماحول تھا جس نے اسے منفردہستی ہی نہیں منفردشاعرہ بھی بنادیا۔زندگی اسے ہرقدم پرڈراتی دھمکاتی رہی پھر بھی اس نے بڑی استقامت سے اسے بھگتا۔اب یہاں''خودکلامی'' کے ان موضوعات پرروشنی ڈالی جاتی ہے جنہیں بالترتیب ہوامزاج، نظریۂ عشق ،ہجروصال کی دھوپ چھاؤں،آس کی پنکھڑی،چشمِ سردمہر،تماشۂ دگر،اعتراف خطا اور تجدیدِ وفا درج کیا گیا ہے۔

ہوامزاج

پروینؔ کی غزلیہ شاعری میں اس کے دوست کا جوتصور اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ ایک ایسا شخص ہے جوانتہائی حسین وجمیل ہے۔جس کی جبیں روشن اور جس کا اندازسخن سب سے جداگانہ ہے، جوزود رنج ہے ہوا کا مزاج رکھتا ہے۔اس کے باوجودشاعرہ اس سے محبت کرتی ہے نہ صرف

محبت کرتی ہے بلکہ اس پر اپنی زندگی کی تمام خوشیاں نچھاور کرنے کے لئے تیار ہے۔لیکن عشق کے تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ جتنی شدّت سے وہ اپنے محبوب کو چاہتی ہے بدلہ میں اس کا محبوب اتنی شدّت سے اسے محبت نہیں دے سکا۔وہ جانتی ہے کہ اس کا محبوب اپنے برتاؤ میں اس کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرتا ہے اس کے باوجود وہ اپنے ستمگر دوست کا قرب ہر پل چاہتی ہے۔وہ اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی کہ دوست سے ملنا وہ اپنی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ اس کے بغیر خود اس کی ذات ادھوری اور زندگی نامکمل ہے۔وہ محسوس کرتی ہے کہ دوست کا قرب زندگی کے سفر میں پیش رفت کے لئے ایک نئی قوت عطا کرتا ہے۔

''خودکلامی'' کے پس منظر میں پروین کی غزلیہ شاعری کے اشعار اس بات کا بھی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مختلف غزلوں میں اس کے یہاں موضوعات کی تکرار بہت ملتی ہے۔جب وہ اپنے محبوب کو ایک پرائے شخص کے روپ میں دیکھتی ہے تو گویا اجنبیت کا احساس اس کے عشق ومحبت میں ایک نئی کشش پیدا کردیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے دوست کے لئے وہ لفظ ''ایک شخص'' کا استعمال بار بار کرتی ہے۔اپنے اس دوست سے ملاقات اور پھر ملاقات کے بعد مختلف تجربات وکیفیات کا انعکاس اس کے آئینہ نظر میں نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس کی شاعری میں ہوا کی علامت اپنے اس دوست کے لئے استعمال ہوئی ہے جس کے مزاج میں ہوا کی کیفیت یعنی ملتے ہی جدا ہوجانے کا عمل پایا جاتا ہے۔''خودکلامی'' میں اس علامت کا استعمال اتنا زیادہ تو نہیں ہوا جتنا اس کے شعری مجموعے ''صد برگ'' میں ہوا ہے۔لیکن ''خودکلامی'' میں بھی گاہے بگاہے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جہاں ہوا کی علامت اپنے مستقل معنویت کے ساتھ تخلیقِ شعر اور اظہارِ فکر کے لئے ترسیل وابلاغ کا کام کرتی ہے۔ذیل میں ہم وہ اشعار درج کرتے ہیں جن کی روشنی میں محبوب کا کردار تشکیل پاتا ہے۔

بھرم ہے مہر و ماہ و نجم کا بھی بس جب تک
مقابل ان کے وہ روشن جبیں نہیں آتا

بات وہ آدھی رات کی ، رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا، اس پہ ترا جمال بھی

اب کے تو یہ ہوا ہے میرے بلانے سے
اس زود رنج شخص کا آنا عجیب تھا

اس کا اندازِ سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی لہجہ وہ مکرنے والا

کھونا تو خیر تھا ہی کسی دن اسے مگر
ایسے ہوا مزاج کا پانا عجیب تھا

دل کا کیا ہے وہ تو چاہے گا مسلسل ملنا
وہ ستمگر بھی مگر چاہے کسی پل ملنا

اس کا ملنا ہے عجب طرح کا ملنا جیسے
دشتِ اُمید میں اندیشے کا بادل ملنا

میں اس سے ملی تھی کہ خود اپنے سے ملی تھی۔
وہ جیسے مری ذات کی گم گشت کڑی تھی

اتنا آسان نہ تھا ورنہ اکیلے چلنا
تجھ سے ملتے رہے اور دھیان سفر پر رکھا

کریں ترکِ زمیں یا جائیں جاں سے
وہی انداز ان کے آسماں سے

نظریۂ عشق

پروینؔ کی نظر میں عشق کا تصور بہت بلند ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس انسان کے دل ودماغ میں یہ اپنا گھر بنالیتا ہے تو پھر اس کی آخری سانسوں تک اس سے جدا نہیں ہوتا۔عشق اور عاشق کی ذات ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے کہ ان کی تکمیل ہی ایک دوسرے میں حلول کر جانے سے ہوتی ہے۔ عشق سے دامن نہیں چھڑایا جاسکتا کہ کوئی بھی انسان اپنی ذات کو کسی بھی صورت میں رد نہیں کرسکتا۔لیکن عشق میں کامیابی ہر عاشق کا مقدر نہیں ہوتی اور دیکھا جائے تو عشق کی معراج ہی ہجر وفراق ہے،لیکن عشق کے راستے پر چلنے والے مسافر کا مقدر اس کے فکر وخیال سے مختلف انجام تک لے جاتا ہے۔پروینؔ نے اپنی شعری مجموعے ''خود کلامی'' میں عشق کو موضوع بنا کر زیادہ غزلیہ اشعار نہیں کہے لیکن کچھ ایسے اشعار ہیں جو اس کے نظریۂ عشق پر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

ہمیں بہت ہے یہ سادات عشق کی نسبت
کہ یہ قبیلہ کوئی ایسا کم نسب بھی نہیں

عشق میں بھی مرنا اتنا آسان نہیں
ذات کو رد کرنا اتنا آسان نہیں

عشق کی رہ کے مسافر کا مقدر معلوم
شہر کی سوچ میں ہو اور اسے جنگل ملنا

عشق چاہتا ہے کہ محبوب کا قرب حاصل ہو اور اگر فاصلے درمیان میں ہوں تو محبوب کا دیدار ہی دل کی راحت وتسکین کے لئے کافی ہوتا ہے۔شاعرہ اس بات کو جانتی ہے لیکن یہ اس کے عشق کی انفرادیت ہے کہ اپنے محبوب کو چاہنے کا اقرار برملا کرتی ہے ۔

بہانے سے اسے بس دیکھ آنا پل دو پل کو
یہ فرد جرم ہے اور آنکھ انکاری نہیں ہے

سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو کچھ ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رک گئی گردشِ ماہ و سال بھی

اور جب محبوب کا وصال نصیب ہو جائے تو خود عاشق اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

اس کو پاکر رہتے ہیں
اپنے آپ میں کھوئے ہوئے

دوست کے لمس اور وصل کی سرشاری تو بہت بڑی بات ہے۔

کون چھو کر انہیں گزرا کہ کھلے جاتے
اتنے سرشار تو پہلے نہ تھے ہونٹوں کے گلاب

عشق و محبت میں خواب کا نشہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔

اب تک وہی نشۂ پذیرائی
کل خواب میں اس گھر گئے تھے
ملتا نہ تھا واپسی کا رستہ
کیا جانئے ہم کدھر گئے تھے

ہجر و وصال کی دھوپ چھاؤں

پروین کی شاعری میں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے لئے دوست کا قُرب سرمایۂ حیات ہے چاہے یہ قُرب دو گھڑی ہی کا سہی چاہے اس کے بعد قسمت میں دربدر ہونا ہی کیوں نہ لکھا ہوا ہو۔

دو گھڑی میسر ہو اس کا ہمسفر ہونا
پھر ہمیں گوارا ہے اپنا در بدر ہونا

اور اس کی وجہ صاف ہے کہ پروین کا شعری کردار عشق و محبت میں جدائی کو اپنا مقدر سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا دوست چاہے اس سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتا ہو ایک دن وہ اس کو ضرور رخصت کرے گا، مزاج کی یہی شناسائی اسے اس بات پر حیران بھی نہیں کرے گی کہ اس کا دوست اسے چھوڑ کر جا رہا ہے۔

اک نہ اک روز تو رخصت کرتا
مجھ سے کتنی ہی محبت کرتا

اتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو
وہ جارہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

ایک مرد کے لئے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے ہمسفر کی جدائی برداشت کر لے لیکن ایک عورت کے لئے اپنے شریکِ حیات سے بچھڑ کر رہنا انتہائی اندوہناک ہے اس لئے کہ جس گھر میں وہ اپنی زندگی کے دن گزارتی ہے وہاں اس کے لئے کوئی ایسا تو ہو جس کے لئے وہ اپنی آنکھوں میں خواب بسائے، سپنے دیکھے، اس کے انتظار میں اپنی آنکھیں بچھائے لیکن تنہائی کے عالم میں دل کا چراغ تو شام ہی سے بجھنے لگتا ہے۔

آسان سہی بچھڑ کے رہنا
پر اس کا سا دل کہاں سے لائیں

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا

شب تنہائی اور ہجر کی رات کبھی مختصر نہیں ہوتی۔ اس رات کی صبح کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ہاں کچھ آنسو ہی آنکھوں میں رہ جاتے ہیں جن کے بہہ جانے سے شاید کچھ دردِ جدائی کم ہو سکے۔

میں ہجر کے عذاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی

روتی رہی اگر میں تو مجبور تھی بہت
وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

مسلسل ہجر کی جان لیوا کیفیت، اس کے باوجود دوست کی کمی کا ناقابلِ برداشت درد زندگی کو

کہ جوایسے وقت میں آجائے جب حبس کا عالم طاری ہو۔زندگی گزارنے کے لئے آس اور اُمید کا ہونا انتہائی ضروری ہے چاہے دروازے پر ہوا کے جھونکے ہی کی آہٹ کیوں نہ ہو محبت کی ماری اسی آس میں دروازہ کھولتی ہے کہ یقیناً اس کا دوست، اس کا محبوب آیا ہوگا۔ کچھ اسی قسم کے خیالات ہیں جو پروین نے تخلیقی سطح پر اپنے محبوب کے انتظار میں کہے ہیں ؎

دستک تو کچھ ایسی ہے کہ دل چھونے لگی ہے
اس حبس میں بارش کا یہ جھونکا بھی تو دیکھوں

زندہ بچا نہ قتل ہوا طائرِ اُمید
اس تیرِ نیم کش کا نشانہ عجیب تھا

اسی اُمید پہ ہر شام بجھائے ہیں چراغ
ایک تارا ہے سرِ بام اُبھرنے والا

کبھی کبھی تو دوست کی آمد سے اس قدر مایوس ہو جاتی ہے کہ اگر واقعی دروازے پہ دوست کی دستک ہو تو بھی یقین نہیں آسکتا ؎

یہ دستکیں یہ مری زندگی کی آدھی رات
ہوا کا شور سمجھ لوں تو کچھ عجب بھی نہیں

کیا کرے میری مسیحائی کرنے والا
زخم ہی یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا

یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پروین کے کلام میں یاسیت اور نا اُمیدی کا رنگ اتنا گہرا نہیں کہ انسان زندگی اور زندگی کی خواہشوں سے لاتعلق ہو جانے کا سبق لے لے۔رجائیت کی بھرپور عکاسی

کرنے والا اس شعر سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے ؎

یوں چاہے خزاں کھڑی ہو دل میں
اک آس کی پنکھڑی ہو دل میں

چشمِ سردمہر

پروین شاکر نے اپنے پہلے دو شعری مجموعوں ''خوشبو'' اور ''صد برگ'' میں اپنے دوست سے جن الفاظ میں شکوہ و شکایت کی ہے وہ بہت سخت ہیں اور لب و لہجے میں بھی تیزی و تندی یا تیز گہرا طنز پایا جاتا ہے۔ ''خود کلامی'' تک پہنچتے پہنچتے اندازِ گفتگو اور طرزِ شکایت میں کچھ نرمی اور دھیما پن پیدا ہو گیا ہے۔ یہاں جب وہ اپنے دوست سے شکوے شکایت پر مائل ہوتی ہے تو اس کے لہجے میں تھکن کا احساس اور مایوسی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

پروین شاکر کو اپنی زندگی کے سفر میں اکیلے پن کا احساس شدید رہا ہے وہ اپنے دوست یعنی شریکِ حیات سے لڑتی جھگڑتی ہے، اس کو مناتی ہے، کبھی خود بھی روٹھ جاتی ہے، کبھی اپنی ضد کے باعث تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر سمجھوتے کے لئے اپنا ہاتھ بھی بڑھاتی ہے لیکن ان سب معاملات دوستی کے باوجود اسے اپنی وفا کے عوض وہ محبت نہیں ملتی جس کی اسے طلب ہے جہاں وہ اپنے شریکِ حیات کو ایک اعلیٰ منصب پر فائز کر کے اس کا ادب و احترام کرتی ہے اسے اس بات کی بھی خواہش ہے کہ وہ سردِ مہر چشم اسے بھی عزت دے اور شریکِ حیات کے ناتے اس سے محبت اور دوستی کا برملا اظہار کرے۔ پروین نے اپنی کئی نظموں میں ان تمام باتوں کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، اس کی غزلیہ شاعری میں بھی ان تفکرات و جذبات کا اظہار بغیر کسی استعارے و علامت کے صاف لفظوں میں ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس بات کا بین ثبوت ہیں ؎

رائے پہلے سے بنا لی تو نے
دل میں اب ہم ترے گھر کیا کرتے

جب ہم کسی اور کا ہوئے رزق
کس کے لئے زندگی کمائیں

دل کا کیا ہے وہ تو چاہے گا مسلسل ملنا
وہ ستمگر بھی مگر چاہے کسی پل ملنا

اور اس سے نہ رہی کوئی طلب
بس مرے پیار کی عزت کرتا

اس چشم سردِ مہر کے سب رنگ دیکھ کر
کیا اشتیاقِ عرضِ تمنا کو دیکھتی

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں

تماشئہ دِگر

جیسا کہ ہم پروین کے شعری مجموعے ''خوشبو'' اور ''صد برگ'' میں اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ پروین کی شاعری میں دو ایسے مثلث ہیں جس کے ایک مثلث میں پروین اس کا شریکِ حیات اور ایک تیسری ذات وہ ہے جس کا رشتہ اس کے شریکِ حیات سے ہے اور دوسری مثلث پروین، اس کے شریکِ حیات اور تیسری اس شخصیت سے بنتی ہے جس سے پروین کی دوستی کا سلسلہ جا کر مل جاتا ہے۔
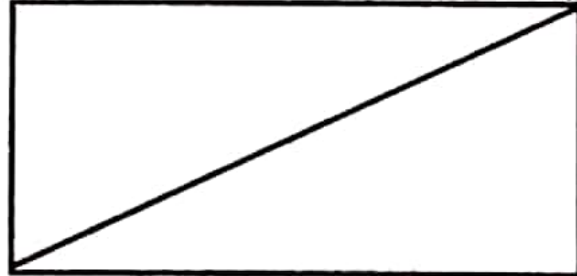
لیکن اس کے تیسرے شعری مجموعے ''خودکلامی'' میں پروین کے دوست کے سائے کہیں نظر نہیں آتے اور عشق و محبت کے معاملات صرف پروین اور اس کے محبوب یعنی شریکِ حیات سے ہی

متعلق ہیں۔اس شعری مجموعے میں انداز وہی شاعرانہ ہے جو پہلے مجموعوں میں دیکھا گیا ہے۔

پروین کے شعری کلام سے یہ ثبوت باربار مہیا ہوتے ہیں کہ وہ اپنے شریکِ حیات سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔محبت اور وفاداری کا ثبوت پیش کرتی ہے اس کے باوجود اس کے ہمسفر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو پایا اور ان دونوں کے ازدواجی رشتے کے درمیان ایک تیسری ذات برابر حائل رہی جس کے باعث پروین کے یہاں رقابت کے ارتعاشات بطورِ خاص دیکھے جا سکتے ہیں۔کبھی کبھی تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ تیسری ذات کو بھی شاید کسی حد تک قبول کرنے کے لئے تیار ہے جو اس کا رقیب ہے اس کے باوجود وہ اپنے شریکِ حیات سے پھر بھی وہ محبت اور رفاقت نہیں پاتی جسے وہ زندگی کے لئے نہ صرف ضروری سمجھتی ہے بلکہ اپنا حق بھی ۔

اب اور کے ساتھ ہے تو کیا دکھ
پہلے بھی کوئی ہمارا کب تھا

کل رات ایک گھر میں بڑی روشنی رہی
تارا مرے نصیب کا تھا اور کھلا کہاں

گلی کے موڑ پہ دیکھا اسے تو کیسی خوشی
کسی کے واسطے ہوگا رُکا۔ ہوا وہ بھی

میں تو ہر چہرے میں اب تک وہی چہرہ دیکھوں
اس کو ہر روز تماشۂ دگر میں رہنا

وہ اپنے شریکِ سفر سے بدگمان اور قدم قدم پر اس پر شک کرتی ہے۔ان تمام حقائق کے باوجود کہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کرنے میں ناکام رہی، اس میں پرائے پن کا احساس دیکھا وہ ہمشہ اُداسیوں میں گھری رہی ۔

بدل دینا ہے رستہ یا کہیں پر بیٹھ جانا ہے
کہ تھکتا جارہا ہے ہمسفر آہستہ آہستہ

یہی کہا کہ نہیں اس کا راستہ تھا الگ
پھر اس کے بعد ہی خود کو اُداس بھی دیکھا

جب کبھی پروین کو اپنے مطلوب کا قُرب نصیب ہوتا ہے تو اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔

آئے ہو تو روشنی ہوئی ہے
اس بام پہ کوئی تارا کب تھا

اس کے برعکس ہجروفراق کی گھڑیاں ذات کا کرب بن جاتی ہیں تو دنیا کی نعمتیں اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ۔

جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرتے
وہ مسافر ہی کھلی دھوپ کا تھا
سائے پھیلا کے شجر کیا کرتے

عذابِ در و بام

انسان کی زندگی میں گھر کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔انسان چاہے کتنا ہی بے سروسامان ہو لیکن اپنے اطراف چاردیواری، دروازے، روشندان اور سر پہ ایک چھت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔موسموں سے اپنے جان و مال کا تحفظ اور بطور خاص رات کی خوف زدہ تنہائی سے بچنے کے لئے ایسی جائے پناہ کا ہونا ضروری ہے جسے گھر کا نام دیا جاتا ہے اور پھر ایک عورت کے لئے تو اپنے گھر سے بڑھ کر اور کوئی جائے پناہ ہی نہیں ہوتی۔ازدواجی زندگی کے رشتوں میں بندھنے سے قبل والدین کا گھر اس کے عہد طفولیت سے لے کر سنہ بلوغیت تک اس کے لئے ایک ایسا مسکن ہے جہاں عزیز و اقارب اور رشتہ داروں کی محبت، خلوص، دوستی اور پیار اس کے لئے سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔اس کے باوجود اسے کسی دوسرے کی امانت اور پرایا دھن کہہ کر بار بار اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ اس کا یہ گھر اس کے لئے عارضی ہے۔حقیقی گھر اس کا اپنا تو اس وقت ہوتا ہے جب وہ زندگی کے سفر میں اپنے شریکِ حیات کی ادھوری زندگی کو مکمل کرتی ہے۔ایسی خواتین جنہیں واقعی اپنے سسرال میں اپنے ہمسفر کی محبت ملتی ہے اسے اپنے گھر میں پرائے پن کا احساس نہیں ہوتا۔وہی گھر اس کے لئے جائے پناہ ہے اور زمانے کی ہوسناک نظروں سے وہ

اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی ہے لیکن جب گھریلو زندگی کے مسائل سر اُٹھاتے ہیں، دلوں کے درمیان فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہی گھر جسے ایک عورت اپنے جان و مال کا محافظ سمجھتی تھی ایک وحشت کدے میں بدل جاتا ہے اور جب اسے اپنے شب و روز کا زیادہ وقت تنہائی میں گزارنا پڑے تو گھر بھی اس کے لئے عذابِ جان بن جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے پیشتر اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ پروین نے عورت کے مسائل کو محض موضوعاتِ شعری کی اساس ہی نہیں بنایا ہے بلکہ اپنی زندگی کے واقعات و تجربات، احساسات و جذبات کو لفظی پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ یہاں صرف شاعرانہ بیان ہی نہیں بلکہ تجربے کی آنچ قاری کو محسوس ہوتی ہے۔ اس کے ایسے اشعار ؎

وہی تنہائی، وہی دھوپ، وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہوا راہگزر میں رہنا

جو دھوپ میں رہا نہ روانہ سفر میں تھا
اس کے لئے عذاب کوئی اور گھر پہ تھا

جب بھی گئے عذاب در و بام تھا وہی
آخر کو کتنی دیر سے گھر جانا چاہئے

تنہائی کے احساس کو بیدار کرتے ہیں اور اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ جب معاملہ ایسا ہو تو گھر اور رہگزر میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اپنے بے تحفظ ہونے کا احساس بھی ان شعروں میں طنزیہ لب و لہجے کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے ؎

ہر نگاہ کا پتھر اور میرے بام و در
شہرِ بے فصیلاں میں کیا ستم ہے گھر ہونا

بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

پہرا دیتے رہتے ہیں جب تک خدشے
کیسے رات کے ساتھ کوئی پھر سو جائے

گھر چاہے جیساہواس سے لاکھ وحشت اورعذاب در وبام کا باعث سہی لیکن اس حقیقت سے کیسے انکارکیاجاسکتاہے کہ گھرآخرگھرہے۔انسان کی زندگی گزارنے کاایک ٹھکانہ،ایک پناہ گاہ اور اس کی بربادی یاتباہی کسے منظورہوسکتی ہے ۔

گھر کے مٹنے کا غم تو ہوتا ہے
اپنے ملبے پہ کون سوتا ہے

اعترافِ خطا

پروینؔ کی شاعری میں ایسے کئی اشعار ہیں جن سے ثابت ہوتاہے کہ اس کادوست، اس کاشریکِ حیات خودترک تعلقات پر مائل ہے۔اس کے اسباب کئی ہوسکتے ہیں جن میں گھریلو زندگی کے مسائل اورعشق ومحبت کے معاملات میں بدگمانیاں بھی شامل ہیں۔پروینؔ نے اپنے دوست کی دوستی پرشک وشبہات کئے،اس کی بے وفائی کواپنے شعروسخن کاموضوع بنایااورشعری اندازمیں اس کے شکوے کئے ہیں وہیں اس نے اپنے کئی شعروں میں اس بات کااعتراف بھی کیا ہے کہ ترکِ تعلقات کے جہاں اورکئی اسباب ہیں خوداس کی ذات سے معاملات حسن وعشق میں کچھ گرہیں پڑگئی ہیں جن کے باعث اس کامحبوب اس سے بے مہرہوگیاہے۔کوئی توایسی بات ہوئی جوترکِ تعلق جیسے المیے کابہانہ بنی ورنہ ''ترکِ وفا''اتناآسان نہیں۔اسکاٹ جیمس نے ٹریجڈی پراظہارخیال کرتے ہوئے ارسطوکے حوالے سے لکھاہے:

"The condition of tragedy are only satisfied, says Aristotle, when the hero is one who is not surpassing by just and good, and when he comes to disaster, not because of vicen or depravity, but through some fault of his own-some error or frailty."1.

اعترافِ خطاپرمشتمل ذیل کے اشعارثبوت کے طورپرپیش کئے جاسکتے ہیں:

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اس کا ہی قصور سارا کب تھا

1.The making of litrature p 71

کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
اس طرح ترکِ رفاقت کرتا

مجھ میں ایسی ہی خامی دیکھی اس نے
ترکِ وفا ورنہ اتنا آسان نہیں

تکلیف تو ہوئی مگر اے ناخنِ ملال
کھلنے لگی گرہ بھی کوئی اپنی ذات کی

بے وفائی مری فطرت کے عناصر میں ہوئی
تیری بے مہری کو اسباب دگر پر رکھا

تجدیدِ وفا

پروینؔ کے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو'' میں تجدیدِ وفا کا احساس شدّت سے ملتا ہے اور دوست کی جانب مراجعت کا خیال اسے بار بار آتا ہے لیکن بعد کے شعری مجموعوں میں یہ بات اتنی شدّت کے ساتھ نظر نہیں آتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تجدیدِ وفا کا خیال یک طرفہ ہے۔ پروینؔ تو چاہے کہ مصالحت اور سمجھوتہ ہو جائے ؂

اک شخص کو سوچتی رہی میں
پھر آئینہ دیکھنے لگی میں

اس کی طرح اپنا نام لیکر
خود کو بھی لگی نئی نئی میں

تو میرے بنا نہ رہ سکا تو
کب تیرے بغیر جی سکی میں

آتی رہے اب کہیں سے آواز
اب تو ترے پاس آ گئی میں

دامن تھا ترا کہ میرا ماتھا
جو داغ بھی تھے مٹا چکی میں

لیکن اس کے دوست کی طرف سے کوئی مثبت رویہ سامنے نہیں آیا ۔

دل کا کیا ہے وہ تو چاہے گا مسلسل ملنا
وہ ستمگر بھی مگر چاہے کسی پل ملنا

تجدیدِ وفا کا رویہ جس مقصد کے تحت سامنے آ رہا ہے اس میں دوست کے قُرب اور وصال کی آرزو پوشیدہ ہے۔ پروینؔ کی یہ آرزو رہی کہ اس کا ہمسفر بھی پھر لوٹ کر آ جائے اور باہمی ربط وتعلق کے وہ لمحات جو ماضی میں گزر چکے ہیں ازسرِ نو سامنے آجائیں چاہے اس کے بعد پھر اس کی قسمت میں وہی شکست ہی کیوں نہ لکھی ہو ۔

عمر کا بھروسہ کیا پل کا ساتھ ہو جائے
ایک بار اکیلے میں اس سے بات ہو جائے

ایک بار کھیلے تو وہ مری طرح اور پھر
جیت لے وہ ہر بازی مجھ کو مات ہو جائے

پروینؔ کی غزلیہ اشعار میں نشاط وکرب اور ہجر و وصال کے جو مسرت اور کرب آمیز موسموں کی آمدورفت ہے ان کے باعث ایک ایسی شعری فضا تشکیل پاتی ہے جس میں پہنچنے کے بعد قاری کے دل ودماغ پر بھی اس کے سائے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ان شعروں میں تجدیدِ عشق بھی ہے ترکِ تعلق بھی اور باہمی اجتناب بھی ہے اور پھر جدائی کے وقت جدائی کا احساس اور بچھڑ جانے کا غم بھی ۔

ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت
تارا سا اک خیال تری چشمِ تر پہ تھا

مجموعہ انکار

ہم پروین شاکر کے پچھلے تین شعری مجموعوں کی غزلیات میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ وہ محبت، رنگ ونور اور خوشبو کی شاعرہ ہے۔'انکار' کے حوالے سے اس کے غزلیہ اشعار میں تعلقات کا ایک ایسا برزخ ہے جہاں انسان ایک ایسی درمیانی حالت میں ہے جہاں محبت اور ترکِ محبت کی ایک مسلسل کشمکش ہے لیکن باہمی قرب واجتناب کے ساتھ محبت اور دوستی کے جگنو بھی کہیں کہیں چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔پروین کی شاعری میں عشق ایک عورت کی جانب سے مرد کے لئے ہے۔یہاں عشق کی وہی پرچھائیں ہے جو میرابائی کے کلام میں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔عام شاعرات کے مقابلے میں پروین کی یہ انفرادیت ہے کہ یہاں اس کا محبوب اس کا شریکِ حیات بھی ہے کہ جس کے باعث محبت محبت ہی نہیں رہتی بلکہ زندگی کی ضرورت بن جاتی ہے۔پروین نے اپنے محبوب کے حسن وجمال کو نمایاں کرنے کے لئے اپنے غزلیہ اشعار میں جن لفظیات کا استعمال کیا ہے ان میں روشنی کی جمالیات نمایاں ہیں زینتِ ماہ، مہرو ماہِ حسن، روشنی، حسنِ جہاں گیر، شعلہ روجیسی لفظیات میں حسنِ لطافت اور حرارت کی کیفیت لبریز ہے۔

پروین کے ابتدائی دو شعری مجموعوں ''خوشبو'' اور ''خود کلامی'' میں ایسے بہت سے غزلیہ اشعار ہیں جن میں پروین کے طنز وملامت کا ہدف اس کا محبوب بنتا ہے لیکن ''انکار'' میں تلخی اور طنز کم نظر آتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں بھی عشقیہ معاملات میں یاسیت اور مستقبل سے مایوسی صاف نظر آتی ہے لیکن بعض شعروں میں کہیں کہیں اُمید کی روشنی بھی دکھائی دیتی ہے۔

سیاسی موضوع کے تناظر میں پروین کے بعض اشعار جو اشارے وکنایے کو اپنے دامن میں رکھتے ہیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ بہترین شعروں کی تخلیق ایسے ہی ماحول میں ہوتی ہے جس کی تشکیل سیاسی جبر سے ہو۔آئندہ صفحات میں پروین کی غزلیہ شاعری کے ان موضوعات پر روشنی ڈالی جارہی ہے جو ایک رجحان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تعلقات کا برزخ

پروین ہی کا ایک شعر ہے ؎

تعلقات کے برزخ میں ہی رکھا مجھ کو
وہ میرے حق میں نہ تھا اور خلاف بھی نہ ہوا

پروین کی شاعری میں تعلقات کے اسی برزخ کی منظرنگاری ہے۔اس کے شعری مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا رشتہ ورابطہ اپنے دوست کے ساتھ اس قسم کا ہے جیسے اوپر سے لاد دیا گیا ہو ۔

تعلقات کے نا معتبر حوالوں میں
تمام عمر کا اک رابطہ ضروری ہے

تعلقات کے نامعتبر حوالے اور پھر تمام عمر کا اک رابطہ ضروری ہے جیسے فکر وخیال سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ وہ جس رشتے کو نبھا رہی ہے اس میں خلوص، وفا اور دوستی کا نام ونشان تک نہیں۔سب اپنے اپنے غم کا بوجھ خود اٹھا رہے ہیں ۔

مدارات الم میں وہ نہیں شرکت کا کچھ قائل
نہ اپنے دکھ بتاتا ہے نہ میرے رنج سہتا ہے

بے تعلقی کا یہی احساس ہے جس کے باعث پروین کا ردِعمل شعر کے پیکر میں کچھ اس طرح ظاہر ہوتا ہے ۔

تیری دنیا سے نکل جاؤں میں خاموشی کے ساتھ
قبل اس کے تو مرے سائے سے کترانے لگے

اب ایسے رشتے کو کیا نام دیا جائے جو ان شعروں سے ہویدا ہے ۔

ہم نے ہی لوٹنے کا ارادہ نہیں کیا
اس نے بھی بھول جانے کا وعدہ نہیں کیا
کارِ جہاں ہمیں بھی بہت تھے سفر کی شام
اس نے بھی التفات زیادہ نہیں کیا

دوست کا رویہ شاعرہ کے دل کو بہت دکھ دیتا ہے،محبت میں جو درد وغم ملتے ہیں ان کا مداوا الفاظ سے نہیں ہو سکتا بلکہ عملی طور پر اس کیلئے محبت کا جواب محبت اور دوستی کا جواب دوستی سے دینا پڑتا ہے ۔

دکھ پہنچتا ہے بہت دل کو رویے سے ترے
اور مداوا ترے الفاظ نہیں کر سکتے

لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو انسان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ کچھ فیصلے کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو اپنی نوعیت میں مختلف ہوتے ہیں ۔

اس کشمکش میں ہم نے ہی کھینچا وفا سے ہاتھ
بارِ جفا سے کوئی سبک دوش ہو گیا

بھلا کے وہ ہمیں حیران ہے تو کیا کہ ابھی
اسی طرح کا ہمیں بھی کمال کرنا ہے

پروین جب انتقاماً ایسا کوئی فعل کرتی ہے جو محبت کے شایانِ شان نہیں ہوتا تو دراصل اس وقت پروین خود پروین نہیں ہوتی بلکہ اسکے اندر ''تیرے جیسا'' یعنی محبوب کا کردار سرایت کر جاتا ہے ۔

مجھے تجھ سے جدا رکھتا ہے اور دکھ تک نہیں ہوتا
مرے اندر ''ترے جیسا'' یہ آخر کون رہتا ہے

پروین کا خیال ہے کہ انسان یا تو محبت کرے یا ترکِ محبت کرے ورنہ ان دونوں کے درمیان کی حالت عالمِ برزخ سے کم نہیں ۔

واضح تو ہوا ترکِ محبت کا ارادہ
بارے دلِ آشفتہ کو آرام تو آیا
شب سے بھی گزر جائیں گے گر تیری رضا ہو
دورانِ سفر مرحلۂ شام تو آیا

کبھی کبھی دوست کا مائل بہ توجہ ہونا باعثِ حیرت ہوتا ہے ۔

دیکھا ہے گریز اس نگاہِ سرد کا اتنا
مائل بہ توجہ ہے تو حیران بہت ہوں

ورنہ یہ فیصلہ تو کب کا ہو چکا! ۔

وہ چاہے تو راستہ بدل لے
میں نے تو دیا جلا دیا ہے

پیش کردہ شعروں کی روشنی میں دو محبت کرنے والوں کا جو کردار ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ہمارے سامنے

نمایاں ہے۔اس میں بارِ جفا سے سبک دوشی کے ساتھ ساتھ رشتہ کی یہ نوعیت بھی قابلِ توجہ ہے ؎

سنتی ہوں کہ میرے تذکرے پر
ہلکی سی اس آنکھ میں نمی تھی

اورحقیقت بھی یہی ہے کہ جہاں پروین کی شاعری میں تعلقات کے برزخ اور باہمی اجتناب کی تصویریں دیکھتے ہیں وہیں بعض شعروں کے حوالے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان کے دلوں کے گوشوں کو کبھی کبھی محبت اوردوستی کے جگنومنور کرتے رہتے ہیں۔ورنہ ایسے خیالات کی اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ ؎

تمام عمر تاسف میں ہی بسر ہوگی
تری طرف سے نظر بے رخی تو کرجائے

پھر اس کے بعد جہاں میں کہیں پناہ نہیں
ترے حضور یہ جاں سرکشی تو کرجائے

شہرِ جمال کے خس و خاشاک ہوگئے
اب آئے ہو جب آگ سے ہم خاک ہوگئے

اے ابرِ خاص ہم پہ برسنے کا اب خیال
جل کر ترے فراق میں جب راکھ ہوگئے

دوست کا کردار

شعری مجموعہ ''انکار'' کی روشنی میں پروین کا محبوب انتہائی حسین وجمیل ہے۔اس کے بام پر آجانے سے رنگ ونور کی بزم سج جاتی ہے اورچاند کچھ اورخوبصورت نظر آنے لگتا ہے۔وہ ایک ایسی روشنی ہے جس کی موجودگی سے دل کا حجرۂ تاریک بھی منور ہوجاتا ہے۔اس کا حسن، حسن جہانگیر ہے۔اس کے شعلہ روکو دیکھ کر ایک آنچ سی روح تک اُترنے لگتی ہے۔پروین نے اپنے محبوب کے حسن وجمال کو نمایاں کرنے کے لئے جن لفظیات کا استعمال کیا ہے ان میں روشنی

کی جمالیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں زینتِ ماہ، مہر و ماہِ حسن، روشنی، حسن جہانگیر، شعلہ رو، ان تمام لفظیات میں حسن لطافت اور حرارت کی کیفیت لبریز ہے ۔

سج گئی بزم رنگ و نور ایک نگاہ کے لئے
بام پہ کوئی آ گیا زینتِ ماہ کے لئے

اے مہر و ماہ حسن ترے عہد میں کبھی
دن ہی ہمیں خوش آئے نہ آئی ہے راس شب

اسی کی آس میں ہے دل کا ہجرۂ تاریک
وہ روشنی جو کبھی میرے گھر نہیں آتی

سب کیلئے جاری ہے تو اے حسنِ جہانگیر
اس بار غریبوں سے بھی انصاف کیا جائے

روح تک جس کی آنچ آتی ہے
کون یہ شعلہ رو ہے دل کے قریب

چونکہ پروین کا دوست خود حسن کا پیکر ہے اسلئے وہ ہمیشہ انتخاب رنگ میں مصروف ہوتا ہے اور اسے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کا چاہنے والا اس کے عشق میں روشنی سے محروم بھی ہے ۔

تو انتخاب رنگ میں مصروف اور ادھر
کوئی ترے جنوں میں سیاہ پوش ہو گیا

لیکن جہاں وہ صورت میں بہت خوب ہے وہیں بباطنِ انتہائی سنگدل اور کرخت لہجے کا مالک ہے۔اس کی شخصیت میں اس کے چاہنے والے کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں۔اس کا رویہ دل کو دکھانے والا اور اس کا لہجہ طنز کا حامل ہوتا ہے ۔

خلق کی بھیجی ہوئی ساری ملامت اک سمت
اس کے لہجے میں چھپا تیر و تفنگ اور ہی تھا

دکھ پہنچتا ہے بہت دل کو رویے سے ترے
اور مداوا ترے الفاظ نہیں کر سکتے

لفظوں سے مداوا ہو یا نہ ہو لیکن پروین کے لئے ایسی گفتگو بھی اپنے دوست کی عنایت سے کم نہیں۔

مل لیتا ہے گفتگو کی حد تک
اتنا ہی ترا کرم بہت ہے

دوست کے تغافل آمیز رویے کے باوجود جب وہ رخصت ہونے لگتا ہے تو پروین کا دل دونیم ہو جاتا ہے۔

رخصت کی گھڑی کھڑی ہے سر پر
دل کوئی دونیم کر گیا ہے

شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ کچھ لمحوں کی ملاقات میں دوست سے وفا تو کجا وہ بے رخی بھی حاصل نہیں ہوتی جس کا رشتہ دوستی سے ملتا ہے۔

تیرے کرم کی دھوپ تو خیر کسے نصیب تھی
تیرے ستم کے ابر بھی اور کہیں برس گئے

پروین اپنی شاعری میں جس محبوب کا ذکر کرتی ہے وہ کوئی اور نہیں اس کا ہمسفر، اس کا شریکِ حیات ہے جو زندگی کی شاہراہ پر چلتے ہوئے کسی موڑ پر اپنے ساتھی کو چھوڑ گیا ہے۔ ایک طرف محبت کی یہ مثال دیکھئے۔

میں تو اُڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لئے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیاد کا

ہرجائی پن کا یہ عالم ہے۔

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

ایسی کوئی بات بھی نہیں کہ پروین کے محبوب کو کسی بات کا دکھ ہی نہیں۔ بعض شعروں میں کہیں کہیں ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جیسے اس کے شریکِ حیات پر بھی کسی نہ کسی غم کا سایا ضرور ہے۔ دونوں دکھ کے مارے ہیں لیکن دونوں کا طرزِ اظہار ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔

میرا دکھ بھی میرے چہرے سے نہیں کھلتا ہے
اور سرِ بزم ہے فرخندہ بظاہر وہ بھی

مدارات الم میں وہ نہیں شرکت کا کچھ قائل
نہ اپنے دکھ بتاتا ہے نہ میرے رنج سہتا ہے

اس کی حرمت کا مرے دل کو بھی ہے پاس بہت
چپ رہے گا مری ناموس کی خاطر وہ بھی

لیکن ان سب باتوں کے باوجود پروین کے محبوب کے کردار میں یک رنگی نہیں ہے۔ وہ جہاں پروین کے عیبوں پر پردہ رکھ دیتا ہے وہیں پھر اس سے دوبارہ اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ محبوب کا یہ کردار شعری پیکر میں کچھ یوں ادا ہوا ہے ۔

ایک بار اس نے میرے عیبوں پر پردہ رکھ لیا
اس رعایت کو مگر بارِ دگر رکھا نہیں

اب جو بدلا ہے تو اپنی روح تک حیران ہوں
تیری جانب سے میں شاید بے یقیں ایسی نہ تھی

پروین کے ابتدائی دو شعری مجموعوں ''خوشبو'' اور ''خود کلامی'' میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جن میں پروین کے طنز و ملامت کا ہدف اس کا محبوب بنتا ہے لیکن ''انکار'' میں تلخی اور طنز بہت کم نظر آتا آتے ہیں۔ جہاں پروین کے شعروں سے ہم نے اس کے محبوب کے کردار کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ان شعروں میں محبوب کی شخصیت پر ہلکے سے طنز کا انعکاس ذیل کے شعر میں نظر آتا ہے جس میں تغزل بھی اپنے معراج پر ہے ۔

درد نے پوری طرح کی نہیں تہذیب اس کی
ابھی اس دل کو ترا حلقہ نشیں رکھنا ہے

عشق

میر کامشہورِزمانہ شعر ہے ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب ہوئے راکھ انتہا یہ ہے

میر نے عشق کی ابتدا وانتہا پر روشنی ڈالتے ہوئے عشق کی ابتدا کو آگ اور انتہا کو راکھ کہا ہے۔یہ انسانی زندگی کے انفرادی تجربات ہوتے ہیں ورنہ عاشقوں کے لئے یہ بھی کہا گیا ہے ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

پروین کا عشق اس کے شعری مجموعے ''انکار'' کی روشنی میں رنگ ونور اور خوشبوؤں سے معطر نظر آتا ہے۔اس کے شعری کلام سے بطورِخاص شعری نظموں کے حوالے سے ابتدائے عشق میں جہاں زندگی اور روشنی ہے وہیں لذتیت کا شائبہ بھی ملتا ہے۔باغ اور گلستاں کے استعارے اس کی اپنی نجی زندگی اور گھریلو چاردیواری کی معنویت کو پیش کرتے ہیں۔بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ پروین نے باغ اور گلستاں کو دنیایا عشق کے لئے بطورِتشبیہ کے اپنے شعری اسلوب میں استعمال کیا ہو۔

پروین کے شعری کلام میں گلستاں کا لفظ جب معنوی اعتبار سے عشق کے لئے استعمال ہوتا ہے تو پھر اس کے تلازمات تمام ترتفہیم وافہام کی سطح پر ایک بہاریہ فضا کی تشکیل کرتے ہیں ؎

پھول سے کھلتے چلے جاتے ہیں جیسے دل میں
اس گلستاں میں عجب موجِ طرب آئی ہے

اور اسی موجِ طرب کے ساتھ ساتھ جب بادِبہاری محبوب کی آمد کی خبر اس کی خوشبو سے دیتی ہے تو قرب کا احساس کروٹیں لینے لگتا ہے۔لیکن جن کے مقدر میں قرب دوست نہیں ہوتا وہ دور ہی سے ایک نگاہ کر لیتے ہیں اس لئے بھی کہ حقیقی محبت کرنے والا نمائش اور کسی منفعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتا ؎

کچھ خبر لائی تو ہے بادِ بہاری اس کی
شاید اس راہ سے گزرے گی سواری اس کی

سب گرد تھے اس کے اور ہم نے
بس دور سے اک نگاہ کی تھی

ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جو اے مرے شہریارِ حسن
آئے نہیں تری طرف منصب و جاہ کیلئے

بعض دفعہ تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی کو چاہتا ہے اور مطلوب کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی یہاں تک کہ دنیا کی تمام ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر عشق اپنے دل کو حسن کی چاہ میں برباد کر دیتا ہے اس لئے بھی کہ جیسا ذکر کیا جا چکا ہے کہ عشق میں معاوضہ، جاہ و منصب یا کسی قسم کی منفعت نہیں دیکھی جاتی بلکہ زندگی کی تمام کائنات حسن پر نچھاور کر دی جاتی ہے ۔

بڑی امید تھی کار جہاں میں دل سے مگر
اسے تو تیری طلب میں خراب ہونا تھا

عشق کرنا ہے تو پھر سارا اثاثہ لائیں
اس میں تو کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

عاشق کے لئے تو یہی بہت کچھ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے وہ دنیا میں اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہو اور اسے زندگی کے مسائل چھو بھی نہ سکیں ۔

کیا ہے اگر نہیں نصیب میرے لباس کو رفو
طرۂ درفشاں تو ہے تیری کلاہ کے لئے

ورنہ یہ تیز دھوپ تو چبھتی ہمیں بھی ہے
ہم چپ کھڑے ہوئے ہیں کہ تو سائباں میں ہے

اگر دوست کو آسودگی نصیب ہو تو اس کے حصے کے تمام آلام زندگی قبول کئے جاسکتے ہیں مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے صاف ظاہر ہے کہ پروین کے عشق میں وفا ہے، خلوص ہے اور دوستی کی مہک ہے۔ جس میں خودغرضی کا شائبہ تک نہیں بلکہ اپنے محبوب کے لئے نیک تمنا ہے اور اس کی زندگی کے لئے نیک خواہشات بھی۔

یقینِ صبح کی لو

پروین کی شاعری میں تصور حیات انتہائی قوی اور توانا نظر آتا ہے، زندگی جو جئے جانے کے قابل ہے بشرط یہ کہ اس سفر حیات میں جو ہمسفر ہو وہ ہم مزاج اور ایک دوسرے کی عزت کرنیوالے ہوں ورنہ مزاجوں کا فرق دلوں میں فاصلہ پیدا کر کے خوشگوار زندگی کو بھی تلخ بنا دیتا ہے۔ پروین کے یہاں چونکہ دو دوستوں کے دلوں میں فاصلہ اور مزاجوں میں فرق ہے اسی باعث اس کی شاعری میں رجائیت سے زیادہ یاسیت اور مستقبل سے مایوسی نظر آتی ہے۔ لیکن اُمید کی روشنی اور یقینِ صبح کی لو کہیں کہیں نظر آتی ہے جیسے ''انکار'' کے ان شعروں میں ؎

دل میں یقینِ صبح کی لو جو ذرا بلند ہو
کافی ہے ایک ہی دیا شب کی سیاہ کیلئے

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری
صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھتے ہیں

گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
اس سے اگلے موڑ کوئی ہمسفر ہونے کو ہے

ایک ان دیکھی خوشی رقصاں ہے برگ و بار میں
باغِ ہستی میں مرے موسم ہے ابر و باد کا

ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ
اس شہرِ بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

ہراسِ شب

''انکار'' کے شعری ماحول میں خوف کا عنصر بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے چاہے وہ سماجی زندگی ہو یا عالم محبت دونوں جگہ ایک خوف کا سایا پروین کے دل و دماغ پر مسلط رہتا ہے۔ شہر میں رہتے ہوئے بظاہر تو نظر آتا ہے کہ سماجی سطح پر بازار اور محفلیں پُر رونق ہیں اور اہل شہر کو امن و امان اور تحفظ حاصل ہے لیکن یہ خوف بھی برابر موجود ہوتا ہے کہ جانے کب کوئی سانحہ وقوع پذیر ہو جائے تو ظاہر ہے کہ وہ خوشیاں جو خوف کے ماحول میں حاصل ہوں ان میں حقیقی روح نہیں ہو سکتی۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے راہ چلتے وقت ایک خوف کا سایا تعاقب میں لگا رہتا ہے ۔

رونقِ بازار و محفل کم نہیں ہے آج بھی
سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

شاید کہ کل کی صبح قیامت ہی بن کے آئے
اُتری ہے جسم و جان پہ بن کر ہراسِ شب

وہ خوف ہے کہ سرِ شام گھر سے چلتے وقت
گلی کا دور تلک جائزہ ضروری ہے

وہ اشعار جن میں خوف کا احساس جلوہ گر ہے اور جن کا تعلق معاملاتِ حسن و عشق سے ہے اس نوعیت کے ہیں ۔

تیرے جانے پہ اب کے کچھ نہ کہا
دل میں ڈر تھا ملال تھا کیا تھا

جس نے تہہ سے مجھے اچھال دیا
ڈوبنے کا خیال تھا کیا تھا

یوں وحشتِ رخصت میں نہ اس دل کو رکھا جائے
جانا ہے کسی کو تو اچانک ہی چلا جائے

جدائی

زندگی کی تمام رونقیں، دوست واحباب کی محفلوں اور قربت کے باعث آباد رہتی ہیں۔ مشہور بات ہے کہ انسان خوشی تو دوستوں میں بانٹنا چاہتا ہے لیکن غم اکیلے ہی سہنا پڑتا ہے۔ اُردو شاعری میں ہجر و فراق کے موضوع پر بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ پروین کے شعری مجموعے ''انکار'' میں بھی اس موضوع پر درد و سوز میں ڈوبے ہوئے شعر موجود ہیں اور پھر ایک ایسی شاعرہ جس نے زندگی کی کچھ بہاریں اپنے شوہر کے ساتھ گزاری ہوں لیکن اس کے بعد ہجر و فراق جس کا مقدر بن چکا ہو، اس کی شاعری میں درد و غم کا احساس اور جذبے کی تڑپ شعری سطح پر قاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتی۔ پروین زندگی گزارنے کے لئے دوست کے قرب کو بہت اہمیت دیتی ہے اور اس چیز کا احساس اسے اس شدت کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ ایک طویل جدائی کے بعد چند لمحوں کی ملاقات بھی اس کے لئے موجِ طرب انگیز ثابت ہوتی ہے ۔

وہ کیسی کہاں کی زندگی تھی
جو تیرے بغیر کٹ رہی تھی

اور جدائی میں صبر تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ صبر وقت کے ہاتھوں ایک جبر ہوتا ہے جسے بہر حال مل کر بچھڑنے والوں کو سہنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور کے لئے جدائی تکلیف دہ نہ ہو لیکن پروین کے لئے یہ ایک اذیت ناک حالت ہوتی ہے ۔

وہ ہم نہیں جنھیں سہنا یہ جبر آ جاتا
تری جدائی میں کس طرح صبر آ جاتا

اس لئے کہ زندگی کے ساتھ زندگی کے تمام تر مناظر بھی اپنا منظر نامہ بدل دیتے ہیں۔ جب تک کوئی ہمارے پاس ہوتا ہے ہمیں اس کی موجودگی کا احساس شاید اس وقت اتنا نہیں ہوتا جتنا کے دور ہو جانے سے ہوتا ہے۔ پروین کہتی ہے ۔

ہر چیز فاصلے پہ نظر آئی ہے ہمیں
اک شخص زندگی میں ہوا مجھ سے دور کیا

اک شخص کیا گیا کہ بھرا شہر دفعتاً
بے حوصلہ و بد دل و کم کوش ہوگیا

اور پھر اس اذیت ناکی کا کیا کیا جائے کہ جدا ہونے والا تو زندگی کی اور بہاروں سے لطف اندوز ہو اور اس کا دوست اس کی محفلوں سے دور کہیں اس کی یاد میں ہجر و فراق کے صدمے اُٹھا رہا ہو ۔

کوئی بتائے کہ جشنِ بہار کیسے منائے
اک ایسی بیل جو صحنِ چمن سے باہر ہو

شاید مقدر میں یہی لکھا تھا کہ محبوب کی سرزمین دل پر قیام بہت کم عرصہ ہی کے لئے ہو پھر اس کے بعد تمام یادوں کا سرمایہ خواب وخیال بن کر رہ جائے گا ۔

بس اتنی عمر تھی اس سرزمینِ دل پہ مری
پھر اس کے بعد اسے وہم و خواب ہونا تھا

انتظارِ دوست میں دوست کی راہ تکتے تکتے جب آنکھوں کی روشنی بھی دھندلا جائے تو پھر زندگی کا سہارا خواب ہی بن سکتے ہیں۔ پروینؔ کے ذیل کے شعر میں اسی کیفیت کا انعکاس بخوبی دیکھا جاسکتا ہے ۔

اب تو بس خواب کی بیساکھی پہ چلنا ہوگا
مدتیں ہوگئیں اس آنکھ کو معذور ہوئے

جب انسان اپنی پسندیدہ شئے کو کھو دیتا ہے اور کوئی شئے اس کی نظر کو نہیں بھاتی تو وہ اپنی ہی ذات میں لوٹ آتا ہے۔ اس لئے بھی کہ یہی تو وہ ذات تھی جس نے کسی سے محبت کی، اس کا انتظار کیا اور اپنی آنکھوں کی بینائی گنوادی۔ جب کسی سے حقیقی محبت ہوتی ہے تو وہ دوست کی کمی بہرحال محسوس کرتا ہے ۔

اس بار تو اپنے پاس تھے ہم
پھر کس کے لئے اداس تھے ہم

شکوہ وشکایت

شعری مجموعے ''انکار'' میں معاملات حسن وعشق سے متعلق پروینؔ نے غزلیہ اشعار میں اپنے محبوب سے شکوہ وشکایت سے گریز کیا ہے۔ اس شعری مجموعے میں اس موضوع پر کچھ زیادہ

مواد نہیں ملتا اور جو ملتا ہے اس میں بھی لب ولہجے میں طنز اور تلخی نہیں نہ بلند آہنگی ہے بلکہ رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی ہے جس سے انداز بیان میں ایک اچھوتا پن پیدا ہو گیا ہے ؂

کب شکوۂ تغافل و بیداد سب سے ہے
تجھ سے گلا ہے اور نہایت ادب سے ہے

ہم فقیروں میں کسی طور شکایت تیری
لب پہ آئی ہے تو تا حدِ ادب آئی ہے

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

باغ کا حصہ تو میں بھی ہوں مگر میرا وجود
سبز بھی اتنا نہیں ہے اور کچھ خود رو بھی ہے

آئینۂ ذات

پروینؔ کی شاعری میں ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ میرؔ کا اندازِ سخن جس میں درد و سوز اور کہیں سے دھواں اُٹھنے کی کیفیت نظر آتی ہے یہاں تک کہ میرؔ کا لب ولہجہ بھی پروینؔ کے رنگ سخن کو کسی حد تک میرؔ کا مقلد بنا دیتا ہے۔ پروینؔ نے خود اپنی ذات کے متعلق جن شعروں میں تخلیقی سطح پر اظہار خیال کیا ہے وہاں مختلف استعاروں کے سہارا لے کر اپنی حیثیت اور اپنے وجود کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس شعر میں ؂

زرد ہوتا جا رہا ہے صحن دل کا ہر شجر
جس طرح اندر ہی اندر دکھ کوئی کھانے لگے

تو لہجے کی دل سوزی لفظوں میں سمٹ کر قاری کو اپنی ہم نوا بنا لیتی ہے۔ اندر ہی اندر کوئی دکھ کھائے جا رہا ہے لیکن اس کیفیت پر کوئی پردا نہیں، کوئی نقاب نہیں۔ اندر کا دکھ پروینؔ کی شاعری میں اندر کا دکھ نہ رہ کر معنویت کی سطح پر تخلیق شعر کی اساس بن جاتا ہے اور تخلیق کار کی لاکھ کوششوں کے

مواد نہیں ملتا اور جو ملتا ہے اس میں بھی لب ولہجے میں طنز اور تلخی نہیں نہ بلند آہنگی ہے بلکہ رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی ہے جس سے انداز بیان میں ایک اچھوتا پن پیدا ہو گیا ہے ۔

کب شکوۂ تغافل و بیداد سب سے ہے
تجھ سے گلا ہے اور نہایت ادب سے ہے

ہم فقیروں میں کسی طور شکایت تیری
لب پہ آئی ہے تو تا حدِ ادب آئی ہے

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

باغ کا حصہ تو میں بھی ہوں مگر میرا وجود
سبز بھی اتنا نہیں ہے اور کچھ خود رو بھی ہے

آئینۂ ذات

پروین کی شاعری میں ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ میر کا اندازِ سخن جس میں درد و سوز اور کہیں سے دھواں اُٹھنے کی کیفیت نظر آتی ہے یہاں تک کہ میر کا لب ولہجہ بھی پروین کے رنگ سخن کو کسی حد تک میر کا مقلد بنا دیتا ہے۔ پروین نے خود اپنی ذات کے متعلق جن شعروں میں تخلیقی سطح پر اظہار خیال کیا ہے وہاں مختلف استعاروں کے سہارا لے کر اپنی حیثیت اور اپنے وجود کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس شعر میں ۔

زرد ہوتا جارہا ہے صحن دل کا ہر شجر
جس طرح اندر ہی اندر دکھ کوئی کھانے لگے

تو لہجے کی دل سوزی لفظوں میں سمٹ کر قاری کو اپنی ہم نوا بنا لیتی ہے۔ اندر ہی اندر کوئی دکھ کھائے جا رہا ہے لیکن اس کیفیت پر کوئی پردا نہیں، کوئی نقاب نہیں۔ اندر کا دکھ پروین کی شاعری میں اندر کا دکھ نہ رہ کر معنویت کی سطح پر تخلیق شعر کی اساس بن جاتا ہے اور تخلیق کار کی لاکھ کوششوں کے

باوجود ''ظاہر اور کچھ بباطن کچھ'' پرعمل نہ کرتے ہوئے رشتوں پر مصنوعی پن نہیں آنے دیتا ۔

دکھ اوڑھتے نہیں کبھی جشنِ طرب میں ہم
ملبوسِ دل کو تن کا لبادہ نہیں کیا

لہجے کی دل سوزی ذیل کے اشعار میں بھی دادِ سخن حاصل کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔

شیشۂ جاں کو مرے اتنی ندامت سے نہ دیکھ
جس سے ٹوٹا ہے یہ آئینہ وہ سنگ اور ہی تھا

ہم سے فروغ خاک نہ زیبائی آب کی
کائی کی طرح تہمتِ پوشاک ہوگئے

خوشبو تو بن نہ پائے سو کچھ ہم سے بے ہنر
اے موجۂ صبا ترے پیچاک ہوگئے

اور پھر یہ شعر ۔

ماتم کی فضا ہے شہرِ دل میں
مجھ میں کوئی شخص مر گیا ہے

تو کچھ ایسی فضا تشکیل کررہا ہے کہ جس میں پہنچ کر قاری میرؔ کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پروینؔ کے یہاں انا اور خودداری کا احساس نمایاں ہے۔ وہ اپنے مدِ مقابل کے سامنے خودسپردگی کے عمل سے بھی گزر جاتی ہے لیکن اس کا احساس ذات جب اسے شعور کی بلندیوں پر پہنچاتا ہے تو پھر اسی پروینؔ کے شعروں میں انا کا رنگ گہرا دکھائی دیتا ہے لیکن یہ کیفیت اس کے پہلے شعری مجموعوں ہی میں دیکھی جاسکتی ہے ''انکار'' میں شکست انا کا احساس پیدا ہوگیا ہے ۔

چپ کیوں تجھے لگ گئی ہے پروینؔ
سنتے تھے کہ تجھ میں رم بہت ہے

شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ایک وقت گزر جانے کے بعد اس کو اس بات کا شعور ہو چکا تھا کہ ۔

باغ کا حصہ تو میں بھی ہوں مگر میرا وجود
سبز بھی اتنا نہیں ہے اور کچھ خودرو بھی ہے

اسی احساس کے ساتھ قناعت کا یہ انداز بھی قابلِ توجہ ہے ۔

جز غبارِ راہ کچھ پیشِ نظر رکھا نہیں
ہم نے اپنے ساتھ اسباب سفر رکھا نہیں
ایک کوزہ، اک عصا، اک خرقۂ گل کے سوا
ہم فقیروں نے کسی نعمت کو گھر رکھا نہیں

ہم نے پروینؔ کے شعری حوالوں سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے یہاں محبت کی ایک ایسی فضا تشکیل ہوتی ہے جس میں تنہائی ،غم ،فرقت، جدائی اور نا آسودگی کا رنگ گہرا ہے ۔

یہ بھی کیا کم ہے کہ اپنی جنگ میں تنہا نہیں
کار زارِ زندگی میں میرا اک لشکر تو ہے

کارزارِ زندگی میں تنہائی اور غم جیسے شیشۂ جاں کو شکستہ کرنے والے سنگ پاروں کو لشکر کہنے میں بھی یہ شعوری کوشش شریک ہے کہ بہرحال اپنے آپ کو تنہا سمجھ کر وقت اور زمانے کے ہاتھوں سونپا بھی نہیں جا سکتا۔ کچھ اسی قسم کے اشعار پروینؔ نے اپنے شوہر کے اس تعلق اور رشتے کے متعلق بھی کہے ہیں کہ جس میں باوجود فراق کے قُرب کا احساس موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوست سے ناراض بھی ہے، اس سے شکایت بھی کرتی ہے ۔

اے مہر و ماہِ حسن ترے عہد میں کبھی
دن ہی ہمیں خوش آئے نہ آئی ہے راس شب

زندگی کے راستے پر گمراہ ہو جانے کا خوف بھی ہے اس کے باوجود وہ اپنے دوست کو بہرحال اپنے قریب پاتی ہے ۔

فراق میں ہی رہے ہم تو ساری عمر مگر
چراغ سا کوئی نزدیک جان روشن تھا

دنیا سے بے نیاز ہوں اپنی ہوا میں ہوں
جب تک میں تیرے دل کی محبت سرا میں ہوں

میؔر نے ایک جگہ کہا ہے ۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ناکامیوں سے کام لینے کا ہنر پرویؔن کے یہاں بھی دیکھا جاسکتا ہے اور پھر اپنی ذات کے متعلق اس کا یہ کہنا ۔

ہوا کے ہوتے ہوئے روشنی تو کر جائے
مری طرح سے کوئی زندگی تو کر جائے

اس کی پوری عاشقی اور زندگی کا انعکاس پیش کرتا ہے ۔

تازہ محبتوں کا نشہ

ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ پرویؔن کو زیادہ تر زندگی کا سفر تنہا ہی طے کرنا پڑا ہے لیکن اس نے اپنی جان کے قریب ہمیشہ ایک روشن چراغ کو محسوس بھی کیا ہے۔ ''انکار'' کے شعری تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ جس اُمید میں جی رہی تھی اور جن خوش گمانیوں نے اسے محبوس کر رکھا تھا وہ آخر کامیاب ہوئیں اور باہمی اجتناب کے مارے ہوئے دو انسان باہمی کشش میں مبتلا ہو گئے۔ تجدیدِ وفا کا رنگ پرویؔن کے شعروں میں نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے جو ہمارے بیان کی تائید میں ثبوت کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں ۔

اک چمک سی تو نظر آئی ہے اپنی خاک میں
مجھ پہ بھی شاید توجہ کی نظر ہونے کو ہے

تازہ محبتوں کا نشہ جسم و جاں میں ہے
پھر موسم بہار مرے گلستاں میں ہے

اک خواب ہے کہ بارِ دگر دیکھتے ہیں ہم
اک آشنا سی روشنی سارے مکاں میں ہے

اک شاخِ یاسمین جو تھی کل تک خزاں اثر
اور آج سارا باغ اسی کی اماں میں ہے

زندگی سے سمجھوتہ اور دوست سے مفاہمت پروین کی شعری کائنات میں تلاشِ محبت کے زاویوں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

دل کو اس راہ پہ چلنا ہی نہیں تھا
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے
زندگی میری تھی لیکن اب تو
تیرے کہنے میں رہا کرتی ہے

اور پھر یہ پوری غزل بطورِ مثال پیش کی جا سکتی ہے جس میں تجدیدِ وفا کا موضوع تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔

دل کی حالت ہے اضطرابی پھر
کوئی لائے گا یہ خرابی پھر

ایک مدت کے بعد خوابوں کا
پیرہن ہو گیا گلابی پھر

لے رہی ہے طویل رات کے بعد
زندگی غسل آفتابی پھر

دھیان کی رحل پہ بصد مفہوم
ایک چہرا کھلا کتابی پھر

کٹ ہی جائے گی شب کہ آنکھوں میں
ایک صورت ہے ماہتابی پھر

چھو رہی ہے ہوا زمستانی
شجرِ جاں ہوا شہابی پھر

گر رہے ہیں ترے خیال کے پھول
خوبصورت ہے فرشِ خوابی پھر

ازدواجی رشتہ

پروین شاکر کے غزلیہ اشعار میں کہیں کہیں ازدواجی رشتے کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے لئے اس کا اپنا گھر بھی محبس بن گیا ہو۔ایک گھٹن بھرا ہوا ماحول جس سے فرار ممکن نہیں لیکن طبیعت مائل بہ فرار بھی ہے۔اپنے شوہر کے ملتفت نہ ہونے کا احساس بھی اجاگر ہے اوراس بات کا خوف بھی کہ بہت سے ایسے گھریلو مسائل اور باتیں جن کا گھر کی چاردیواری تک ہی محدود رہنا مناسب ہے کہیں صحن کے باہر تک نہ پہنچ جائیں۔ہم سفری پرخوشی کا اظہار لیکن پھر اسکے بعد ازدواجی رشتوں کی کشش کا انعکاس ذیل کے شعروں میں دیکھا جاسکتا ہے ۔

اس باغ میں اک پھول کھلا میرے لئے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا

لہو سے سینچ دیا اور پھر یہ طے پایا
اسی گلاب کو اب پائمال کرنا ہے

میں تو تا عمر ترے شہر میں رُکنا چاہوں
کوئی آکر مرا اسباب سفر تو کھولے

سیرِ دنیا کرے دل باغ کا در تو کھولے
یہ پرندہ کبھی پرواز کو پر تو کھولے

گھر سے نکلی تو خبر بن جائے گی آپس کی بات
جو بھی قصہ ہے ابھی تک صحن کے اندر تو ہے

رقابت کے جذبے کا احساس اس شعر میں دیکھئے ۔

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

ازدواجی رشتے کی یہ نوعیت بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔

آنی تھی ہمیں رفو گری بھی
اک دوسرے کا لباس تھے ہم

رُکنے کا سمے گزر گیا ہے
جانا ترا اب ٹھہر گیا ہے

وہ پل کہ سُلگ اُٹھا ہے ملبوس
اور اس نے دیا بجھا دیا ہے

مسندِ شاہانہ

جیسا کہ ہم پروینؔ کے پہلے شعری مجموعوں میں دیکھ چکے ہیں کہ اس نے سیاست اور اہل سیاست کو نہایت سخت لہجے میں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جہاں وہ انسانیت کو ذلیل ورسوا کرنے میں سماج کو ملزم ٹھہراتی ہے وہیں وہ اہلِ اقتدار جو طاقت وثروت کے نشے میں ظلم وتشدد کرتے ہیں اور عدل وانصاف سے فرار اختیار کرتے ہیں انہیں ایسے القاب وخطابات سے یاد کرتی ہے جو رعونت اور تکبر کی علامت ہیں ۔

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِ الٰہ کے لئے

شعبۂ رزق خدا نے جو رکھا اپنے پاس
نائب اللہ بہت بددل و رنجور ہوئے

وہی شداد، وہی جنتِ خاشاک نہاد
ویسے ہی عظمتِ یک لحظہ پہ مغرور ہوئے

وہ رعونت ہے کہ لگتا ہے ازل سے یونہی
نشۂ مسندِ شاہانہ سے مخمور ہوئے

حاکمِ وقت کے اطراف وہ پہرا ہے کہ اب
شہر کے دکھ اسے موصول نہیں ہوسکتے

مندرجہ بالا اشعار میں ظلِ الٰہی، نائب اللہ، شداد، مسندِ شاہانہ جیسے شعری لفظیات میں جو گہری معنویت پوشیدہ ہے وہ افہام وتفہیم کی سطح پر پروینؔ کی تخلیقی مہارت کا زندہ ثبوت پیش کررہی ہیں۔

بعض وہ شخصیتیں جنہیں سماج میں اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوتا ہے، ان کے مجروح کردار کو دیکھ کر بھی پروینؔ کا قلم حرکت میں آتا ہے تو وہ انہیں بھی تغزل کے پیرائے میں ہدف ملامت بنانے سے گریز نہیں کرتی ۔

اُمید معجزۂ یک نظر پہ زندہ ہیں
طبیب شہر دعا کے اثر پہ زندہ ہیں

ہم اہل حاجت و ارباب احتیاج تو کیا
فقیہہِ شہر بھی اب حبِ زر پہ زندہ ہیں

قاتل کو کوئی قتل کے آداب سکھائے
دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

مرے قبیلے میں نکلے سبھی فروختنی
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی اصول باقی ہے

☆☆☆

مجموعہ کفِ آئینہ

''کفِ آئینہ''میں غزلیات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔نظموں کے علاوہ صرف چوبیس غزلیں ملتی ہیں جن کے موضوعاتی مطالعے سے جوفکر سامنے اُبھرکرآتی ہے وہ پیراہن غم، دل وحشی کی فریاد،سیاسی طنز اور پروین کی اپنی ذات کااحاطہ کرتی ہے۔پروین نے کچھ ایسے شعر بھی کہے ہیں جن سے خوداس کی اپنی ذات وصفات پرروشنی پڑتی ہے۔بہت سے شعرایسے ہیں جن سے محبوب کاایک ایسا تصور بنتا ہے جس کی سیرت وکرداراور عادت و اطوار تغیر پذیر و متضاد ہیں۔بعض شعروں سے دل وحشی کی فریاد نکلتی ہوئی محسوس کی جاسکتی ہے۔کچھ ایسے بھی اشعار ہیں جو دل وحشی کی فریاد سے مختلف ہیں اور صبح چہر یعنی محبوب کی معتدل اور خوش مزاجی کااعتراف بھی کرتے ہیں۔بعض اشعار میں سیاسی طنز نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اوران میں شاعرانہ خوبی یہ ہے کہ سیاسی،موضوع ہونے کے باوجودبھی ان شعروں میں غزل کا مزاج اور شعریت مجروح نہیں ہونے پاتی۔مجموئی اعتبار سے''کفِ آئینہ'' کی غزلوں میں عہد گزشتہ کی یادیں،لمحاتی کیفیات کاانعکاس اور تصوراتی حسیات دیکھنے کوملتی ہیں۔

زبان وبیان کے اعتبار سے ہواکی علامت کااستعمال زیادہ ہوا ہے۔رعایت لفظی، تراکیب الفاظ،درباری لفظیات اورتاریخی حوالوں سے شعری اسلوب کا تانابانا بنتا ہے۔''کفِ آئینہ'' کی تین غزلیں ایسی ہیں جوایک ہی علامت کو لے کراوراسے بطورردیف استعمال کرکے تخلیق ہوئی ہیں۔ان تین غزلوں کی تین ردیفیں رات برف اور ہواہیں۔

''کفِ آئینہ'' پروین کاپانچواں اورآخری شعری مجموعہ ہے جوان کی المناک موت کے بعد بیاضوں کی شکل میں دستیاب ہوا۔اس مجموعے میں پروین کی مختصرناتمام غزلیں اورمتفرق اشعار بھی دیکھنے کوملتے ہیں جوکسی فکروخیال کے دباؤ کے تحت تخلیق توہوئے لیکن کسی باعث غزل کے پیکر میں متشکل نہ ہوسکے۔

پیراہن غم

پروین کوجب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کادوست اس کاخیال رکھتا ہے،اس سے محبت کرتا ہے،اس کے جذبات کی قدر کرتا ہے،اپنے شب وروز سے کچھ حصہ اس کے لئے نکالتا ہے تواس کی خوشی کی کوئی انتہانہیں رہتی جس کااظہار شعر کے پیکر میں اس طرح ہوا ہے ۔

رکھ اپنے پاس اپنے ماہ و مہر اے فلک
ہم خود کسی کی آنکھ کے تارے ہیں ان دنوں

لیکن دوسرے ہی لمحے ماضی میں کیا گیا دوست کا برتاؤ اسے یاد آتا ہے تو پھر وہی اداسی کا عالم اس کے دل پہ چھا جاتا ہے ۔

تجھ سے ملنے کی سرخوشی کے ساتھ
اک اداسی کی لہر دل میں ہے

جس کے نتیجے میں دورانِ گفتگو کچھ ممکنہ فیصلے بھی ہوتے ہیں اور یہ فیصلے احتجاجی ہی ہو سکتے ہیں لیکن نتیجتاً ۔

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی اس نے کمال کر دیا

دورانِ گفتگو ہونے والے کچھ اور معاملات جن کی تفصیل پروین اپنے شعروں میں کرتی ہے، کچھ اس قسم کے ہیں ۔

ملتے ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فیصلہ کوئی
اس نے مگر بچھڑتے وقت اور سوال کر دیا

وہ جواب دے کر بھی دیر تک رہا سوچتا
کوئی بات ایسی مرے سوال میں مرے آ گئی

گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو پھر اختتام اس المیہ پر ہوتا ہے ۔

سامنے تھا وہ اور دونوں چپ تھے
اب نہ ہم تھے نہ وہ دل رہا تھا

شام کا وہ وقت جو سہانے پن کا احساس دلاتا ہے اگر اس میں کڑواہٹ گھل جائے تو پھر کسی شئے میں کشش نہیں رہتی اور پھر اس کے ساتھ وقت ہی کیا گزارا جائے جس سے رخصت ہونا مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

وقتِ رخصت کے کچھ مرتعش احساسات وجذبات کی جھنکار ذیل کے شعروں میں

دیکھی جاسکتی ہے، جس میں کسک بھی ہے اور دل شکستگی بھی ۔

وقت رخصت آ گیا دل پھر بھی گھبرایا نہیں
اسکو ہم کیا کھوئیں گے جس کو کبھی پایا نہیں

رخصت کی گھڑی کھڑی ہے سر پر
دل کوئی دو نیم کر گیا ہے

تاروں کے لئے بہت کڑی تھی
یہ رخصت ماہ کی گھڑی تھی

رخصت کی کسک رہی ہے اب تک
اک شام سلگ رہی ہے اب تک

کچھ ایسے ہی احساسات وجذبات جن سے غم جھلکتا ہے مندرجہ ذیل شعروں میں بھی پروین کی شاعرانہ فکر کو مہمیز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

مٹھی میں تو رنگ تھے ہزاروں
بس ہاتھ سے ریت بہہ رہی تھی

خشک ہوتی نہیں کسی صورت
غم کی اک ایسی نہر دل میں ہے

کان بھی خالی ہیں میرے اور دونوں ہاتھ بھی
اب کے فصل گل نے مجھ کو پھول پہنایا نہیں

اب یاد نہیں کہ زندگی میں
میں آخری بار کب ہنسی تھی

پیراہن غم سیا ہے کس نے
خوابوں کو کفن دیا ہے کس نے

دلِ وحشی کی فریاد

''کفِ آئینہ''میں جس محبوب کا عکس ابھر کر سامنے آتا ہے اس کی سیرت و کردار اور عادت واطوار تغیر پذیر اور متضاد ہیں۔وہ پروین سے محبت بھی کرتا ہے،اسے یاد کر کے روتا بھی ہے لیکن دنیائے محبت کو سنوارنے کیلئے کوئی قدم نہیں اُٹھاتا۔اس کے دل میں لحہ کیلئے بھی اس کا خیال نہیں آتا جو اس کیلئے پہروں اداس رہتی ہے۔جب کبھی وہ دور رہتا ہے تو پھر جیسے ملاقات کے امکانات ہی ختم ہوجاتے ہیں۔پروین کے جن شعروں سے دل وحشی کی فریاد نکل کر قاری کے سامنے آتی ہے اس کے پسِ پشت اس کے دوست کا کردار بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

بہت رویا وہ ہم کو یاد کر کے
ہماری زندگی برباد کر کے

تیری آنکھوں کا بھی کچھ ہلکا گلابی رنگ تھا
ذہن نے میرے بھی اب کے دل کو سمجھایا نہیں

جز طلب اس سے کیا نہیں ملتا
وہ جو مجھ سے ذرا نہیں ملتا

میں جس کے دھیان میں پہروں اداس رہتی ہوں
خیال دل میں مرا لحہ بھر نہیں لاتا

ایک لمحہ کی توجہ نہیں حاصل اس کی
اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے

کتنا بھی ہو میرا سخت لہجہ
دیبا و حریر و پرنیا تو

پروین کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب اسے کہنا پڑتا ہے ۔

تھک گیا ہے دل وحشی مرا فریاد سے بھی
جی بہلتا نہیں اے دوست تری یاد سے بھی

پروین کا اپنے دوست سے وفاداری کا انداز اور اس سے دلی محبت کا اظہار اس کے کئی شعروں سے ظاہر ہے۔ چاہے دوست کا رویہ اس کے ساتھ ہرجائی پن کا ہو لیکن پروین کا یہ کہنا ۔

ہزار صاحبِ رخشِ صبا خرام آئے
بسا ہوا ہے وہی شہ سوار آنکھوں میں

اسی شہ سوار کو آنکھوں میں بسائے رکھنے کی وجہ شاید یہی رہی ہو ۔

لو چراغوں کی کل شب اضافی رہی
روشنی تیرے چہرے کی کافی رہی

''کفِ آئینہ'' میں کچھ اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو 'دل وحشی کی فریاد' سے مختلف ہیں اور 'صبح چہر دوست' کی معتدل اور خوش مزاجی کا اعتراف بھی کرتے ہیں ۔

ویسے تو وہ شوخ ہے بلا کا
اندر ہیں بہت حجاب اس کے

ایسے محتاط ایسے کم آمیز سے
اک نظر بھی توجہ کافی رہی

اس عشق نے ہمیں ہی نہیں متعدل کیا
اس کی بھی خوش مزاجی کے چرچے ہیں ان دنوں

دھوپ نکلی ہوئی ہے برف کے بعد
کون یہ صبح چہر دل میں ہے

برف میں روشنی گھل رہی تھی
وہ مجھے خواب میں مل رہا تھا

اپنی ذات

پروین نے اپنی ذات وصفات پر بھی گاہے بگاہے اشارے کئے ہیں۔اس کی شاعری میں ایسے تو بہت سے شعر ملتے ہیں جن میں وہ ایک وفا پرست دوست کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اپنے دوست کو اس طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ جس چیز کی اس سے توقع کی جارہی ہے وہ چیز اب اس میں وقت کے ہاتھوں ختم ہو کر بحالتِ مجبوری اس کی ذات اور شخصیت کو بدل چکی ہے۔خود اس کے ظاہر و باطن ایک دوسرے سے اس معنی میں مختلف ہیں کہ بظاہر ٹھنڈے مزاج کی دکھائی دینے والی شخصیت اندرونی طور پر اضطراب و بے چینی کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے ۔

مجھ پر کوئی ریت آکے ڈالے
ویرانے میں ہوں پڑی ہوئی برف
اندر سے سراپا آگ ہوں میں
باہر سے مگر جمی ہوئی برف

پتھر میں گلاب دیکھتا ہے
کس درجہ ہے مجھ سے خوش گماں تو

پلٹ کر پھر وہیں آجائیں گے ہم
وہ دیکھے تو ہمیں آزاد کر کے

تحریرکردہ اشعار کے آخری شعر کے بالکل برعکس ذیل کا شعر بھی قابل توجہ ہے اور پروین کی شخصیت کی پیچیدگی کو ظاہر کرتا ہے ۔

ایک آسیب کے مکان میں ہوں
اور رد بلا نہیں ملتا

سیاسی طنز

سیاست اور اہل سیاست پروین کی شاعری کا موضوع خاص رہا ہے۔اس کے دوسرے شعری مجموعوں میں بھی سیاسی رہنماؤں اور حکمرانِ وقت کے لئے انتہائی طنز آمیز القاب وخطابات استعمال کرتے ہوئے پروین نے انہیں طنز وملامت کا ہدف بنایا ہے اور پھر اس کی شاعرانہ خوبی یہ ہے کہ ایسے مضامین میں بھی غزل کا مزاج اور شعریت مجروح نہیں ہونے پاتی ۔

ہر آمر طول دینا چاہتا ہے
مقرر ظلم کی معیاد کر کے

قاضی شہر نے قبلہ بدلہ
لیک خطبے میں روانی ہے وہی

تھا جھوٹ امیر و تخت آرا
سچائی صلیب پر گڑی تھی

صبح کیا فیصلہ حاکمِ نو کرے
جشن کی رات تک تو معافی رہی

ملک وقوم کی حکمرانِ وقت کے ہوتے ہوئے مظالم اور دشمنوں سے ان کی سیاسی مصلحت آمیز دوستی اور وطن سے بے توجہی بھی موضوع شعر بن کر فنکار کے غم وغصے کا برملا اظہار کرتے ہوئے

نظر آتے ہیں۔

ظلم کے ہاتھوں اذیت میں ہے جس طرح حیات
ایسا لگتا ہے کہ اب حشر ہے کچھ دیر کی بات

اے ہوا کیا ہے جو اب نظمِ چمن اور ہُوا
صید سے بھی ہیں مراسم ترے صیاد سے بھی

شہر کا شہر یہاں ڈوب گیا
اور دریا کی روانی ہے وہی
بدلے جاتے ہیں یہاں روز طبیب
اور زخموں کی کہانی ہے وہی

کچھ ایسے ہی سیاسی رہنما جنہیں سیاست اور زندگی کا بہت زیادہ تجربہ نہیں ہوتا ان کی طرف بھی خوبصورت انداز میں کچھ اس طرح اشارے کئے ہیں۔

کس طرح جان سکے طائرکِ نو آموز
کون ہے جال کشا کون لگائے ہوئے گھات

خیمۂ غیر سے منگوائے ہوئے یہ مخبر
رن پڑے گا تو گھڑی بھر کو نہ دے پائیں گے سات

روز اک دوست کے مرنے کی خبر آتی ہے
روز اک قتل پہ جس طرح کہ معمور ہے رات

اہلِ اقتدار کے قول و فعل میں تضاد پر پروین نے روشنی ڈالتے ہوئے ان کی اس فطرت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں منافقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور۔ شاید سیاست میں یہ سب کچھ ضروری بھی ہے۔

صلح کو فتح کیا دل میں مگر
اب بھی پیغام زبانی ہے وہی

آستینوں میں چھپائے ہوئے ہر اک خنجر
اور گفتار کی بابت میں ہیں سب قند و نبات

ہم کس کی زبان بولتے تھے
گر ذہن میں بات دوسری تھی

پروین اُردو شاعرات میں ایک ایسی لکھنے والی تخلیق کار ہے جس کے یہاں روایتی بناوٹ، تکالیف اور خوف نظر تو آتا ہے لیکن وہ اپنی روح کو دبانا پسند نہیں کرتی بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور حق گوئی سے قاری کو عورت کی نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں مدد دیتی ہے۔ اُس کی شاعری میں عورت کی سسکتی کراہ نہیں بلکہ احتجاجی رویہ ہے۔

> "ترقی کے اس دور میں جب کہ عورت زندگی کے سارے شعبہ حیات پر حاوی ہی نہیں قابض بھی ہو چکی ہے اور ہر میدان میں مرد کو شکست دینے پر آمادہ ہے معاشرہ پھر بھی اُس کے تحفظ کے لئے ایک شوہر کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور غیر شادی شدہ زندگی کو حقیر سمجھتے ہوئے عورت کی بہتری کے لئے ازدواجی رشتے کی حمایت کرتا ہے۔"[1]

پروین کے یہاں شوہر پرتی کے جن جذبات کا اظہار بار بار کیا گیا ہے وہ انفرادی نہیں۔ مشرقی خواتین کے لئے شوہر کا مرتبہ خدا کی عبادت کے بعد سب سے بڑا ہے۔ مشرقی عورت کا یہ ایمان بھی ہوتا ہے کہ شوہر کے محبت بھرے لمس کی طاقت ہی عورت کو جینے کا سہارا دیتی ہے۔ پروین کی شاعری میں ازدواجی رشتے کے تناظر میں عورت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جس میں عورت اول بھی عورت ہے اور آخر بھی۔ اُس کے یہاں شوہر محبت اور نفرت کے

[1] ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور — از خورشید زہرہ عابدی صفحہ ۱۳۷

جھنکوں کے درمیان جھولتا ہوا دیکھائی دیتا ہے۔ پروینؔ کی شاعری میں بطور خاص ''خوشبو'' کے حوالے سے ایک نوعمر لڑکی کے رومان اور جذبات کا بیان ہے کہ اُس نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات کو گہری فکر اور وسیع تخیل میں سمو کر عورت کی دلی کیفیات کا انکشاف کیا ہے۔ اس کے یہاں یہ جذبہ بار بار اُبھرتا دکھائی دیتا ہے کہ وہ نہ صرف چاہے جانے کی آرزو کرتی ہے بلکہ اپنے محبوب سے زبانی طور پر بھی اس کا اظہار چاہتی ہے۔ اُس کے شعری ارتقاء کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ پروینؔ کی شاعری شباب کی منزلوں میں قدم رکھنے والی لڑکی اور پھر اُس کے بعد ازدواجی زندگی کے بندھنوں میں بندھنے والی عورت کی کہانی ہے۔ اُس کی نظمیہ وغزلیہ تخلیقات میں نئی پود کو ایک شعوری پیغام دینے کا عمل ہے جس میں شادی کا غلط تصور اور عورتوں پر مردوں کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

پروینؔ کا کلام پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی شئے بہر حال کھوگئی ہے۔ جس کی کھٹک اُس کے دل میں برابر ہوتی رہتی ہے۔ اور جب وہ شئے ایسی ہو جس کی عدم موجودگی سے انسانوں کے درمیان دیانت داری ختم ہوجائے تو پھر سانس بھی جیسے سینے میں رکنے لگتی ہے۔

پروینؔ خواتین شاعرات میں اپنے منفرد لب ولہجے اور عورتوں کے نفسیاتی مسائل کو پیش کرنے کے باعث اُردو شاعری کو ایک نئی جہت دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُس کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے باک لہجہ استعمال کرتی ہے اور انتہائی جرأت کے ساتھ جبر وتشدد کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے نہیں جو اپنے حقوق پر شرم وحیا کے دبیز اور تہہ دار پردے ڈال دیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ پروینؔ کے موضوعاتِ شعری کچھ مخصوص ہیں لیکن قاری کے لئے اس کی شاعری میں اس کی ہیئت، نغمگی، موزونیت ، الفاظ کی تربیت ان کا خوشگوار استعمال، تراکیب، پیکر تراشی، اندازِ بیان، جذبات کو ابھارنے کی طاقت اور مجموعی بناوٹ بھی توجہ کی چیز ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

کچھ اس کتاب کے متعلق

قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں بعض اوقات موت کو زندگی کا سبب بنا دیتی ہے۔ دیکھیے کہ مجازؔ جیسا اوسط درجے کا شاعر محض اپنی دردناک موت کی وجہ سے ایک نسل کا ہیرو بن گیا، شکیبؔ جلالی اور سارہ شگفتہ اگر فطری انداز میں وفات پاتے تو کیا نئی شاعری کی تاریخ میں انھیں اتنے سنہرے اوراق نصیب ہو سکتے تھے پروینؔ شاکر کا معاملہ بالکل ایسا تو نہیں ہے کہ وہ عزیزہ اپنی زندگی میں بھی کم مقبول نہ تھی لیکن یہ بھی ہے کے وہ تو جیتے جی بھی قسط وار مر رہی تھی جیسا کہ پیش نظر کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر روبینہ شبنم کے مقالے سے اُجاگر ہوتا ہے۔ پھر بھی پچھلے دنوں ایک کتاب نظر سے گزری جس کا عنوان تھا "میر سے پروینؔ شاکر تک" میں سمجھتا ہوں اگر ایسے دردناک حالات میں پروینؔ کی رحلت نہ ہوئی ہوتی تو اس پر قلم اُٹھانے والے اتنے جذباتی نہ ہوتے جتنے کہ اب ہیں۔ شبہ نہیں کہ پروینؔ شاکر نے اردو شاعری کے ایوان کا ایک بالکل نیا دریچہ وا کیا ہے خصوصاً غزل میں تو عورت کے جذبات واحساسات کا گزر بہت کم تھا یہ ویسا تھا جیسا کہ بالا دست مرد چاہتا تھا چنانچہ "ریختی" اُسی کا مسخ شدہ روپ ہے۔ پروینؔ شاکر نے ایک حساس، ذہین، خودنگر اور تعلیم یافتہ خاتون کی عشقیہ اور المناک واردات ایسی خلاّقانہ ہنرمندی سے اپنی غزلیہ اور نظمیہ شاعری میں بیان کی اور اتنی بے باکی سے بیان کی کہ آنے والی شاعرات کے لیے ایک نئے جہان کا دروازہ کھل گیا اب اگر روبینہ شبنم انھیں اردو غزل کی ماہ تمام کہتی ہیں تو ان کا یہ مبالغہ گراں نہیں گزرتا۔ توقع ہے ادبی حلقوں میں انکی پذیرائی ہوگی۔

۱۵ر جنوری ۲۰۰۴ء
D-40، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۲۵

مظفر حنفی
(سابق اقبال پروفیسر)